کچرے میں جنم

مصنّف: حمید اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچرے میں جنم

حمید اللہ

جملہ حقوق

نام کتاب	:	کچرے میں جنم
مصنف	:	حمیداللہ
کمپوزنگ/ٹائٹل	:	غلام مرتضیٰ
اشاعت	:	اوّل2019ء
مطبع	:	
قیمت	:	Rs. 200/-

انتساب

خادم الفقراء

سید محمد منیر شاہ

درگاہِ پیر ذاکری

کے نام

''کچرے میں جنم'' کے مصنف نے کتاب کا ٹائٹل جس بے باکی سے دیا کتاب کے موضوعات میں تفصیلات بھی اسی طرز پر بیان کی ہیں۔ یہ کتاب حمید اللہ صاحب کے تجربات کا شاہکار ہے جس کا انداز افسانوی ہے اور اس کتاب کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ یہ ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکتی ہے۔ جیسا کم میں نے اس کو ایک سفر کے دوران ہی پڑھا ہے۔

یہ کتاب جہد مسلسل کا بیان ہے۔ جو معاشی طور پر کمزور طبقات میں پلے بڑھے نوجوانوں کیلئے مشعل راہ ہے۔ حمید اللہ اور سمیرا گل سے میرا تعلق بھی کئی سالوں پر محیط ہے۔ میں حمید اللہ کی زندگی کے فلسفے سے کافی متاثر ہوں۔ حمید اللہ چیلنجز سے کبھی گھبراتا نہیں۔ بلکہ چیلنجز ان کی زندگی میں زندگی پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

اس کتاب کی بدولت حمید اللہ ہمیں انٹرپنیور شب نہایت سادگی سے سکھا رہے ہیں۔ ان کے تجربات نہایت قیمتی ہیں اور ان کا بیان بھی منفرد ہے جہاں انہوں نے کسی چیلنج کا ذکر کیا وہیں اُس چیلنج کو حل کرنے کی کاوشوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ کتاب قاری کو ہر سطر میں سبق دیتی ہے کہ فرد اپنی لگن اور مسلسل کاوش سے نہ صرف ذاتی زندگی بلکہ معاشرے کی زندگی میں بھی قابلِ قدر تبدیلی لاسکتا ہے۔

حمید اللہ نے انتہائی اختصار سے بہت جامع منصوبے بیان کئے ہیں وہ ایک ہی جملے میں کئی نقطے پلاننگ، طریقہ کار، نتائج اور کافی کچھ سمیٹ دیتا ہے۔ مثلاً ''مری کے ٹھنڈے جنگل کو آگ لگا کر گرمایا جاتا ہے''۔ یہ جملہ متعدد مفاہم اور جہتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

عابد حسین

کچھ مصنف کے بارے میں

تاریخ گواہ ہے دُنیا میں جن لوگوں نے نام کمایا اور شہرت حاصل کی یا بڑی شخصیات کی فہرست میں شامل ہوئے اُن کی زندگی مسلسل جدوجہد میں گزری۔ان لوگوں کی آپ بیتی لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

بڑے لوگوں سے میری مراد قطعی طور پہ پیسے والے یا بااثر افراد نہیں بلکہ اس سے میری مراد وہ عظیم لوگ ہیں جنھوں نے متوسط طبقہ سے تعلق ہونے کے باوجود ایسے کام کیئے جن سے ان کے نام کی دھوم مچی اور ان کے نام کے ڈنکے بجنے لگے۔اگر اُن کی زندگیوں کا جائزہ لیں تو انھوں نے اپنی کامیابی کے سفر کا آغاز کسی نہ کسی مشکل حالات سے کیا ہوتا ہے۔مگر جہد مسلسل اور شبانہ روز محنت سے انھوں نے کامیابی کی منزل حاصل کی ہوتی ہے وہ کبھی بھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کرتے جس وجہ سے مستقبل میں انھیں کافی وقت تک یاد رکھا جاتا ہے۔

''کچرے میں جنم'' کے مصنف حمید اللہ کا تعلق بھی انہی گنے چنے لوگوں میں ہوتا ہے۔جو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔جنھیں اپنا بچپن کچی اور بدبودار گلیوں میں گزارنا پڑا اور کئی مسائل سے دو چار ہو کر اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنا پڑا جس وجہ سے دورانِ تعلیم ہی انھوں نے اپنی زندگی کے مقصد کا تعین کرلیا اور کم عمری سے اپنے علاقے کے مسائل کو سمجھتے ہوئے ان کے حل کیلئے جدوجہد شروع کردی۔اور علاقہ کی ترقی اور اہل علاقہ کی زندگیوں میں بہتری

لانے کو اپنا مقصد حیات بنا لیا ان کا خیال تھا کہ اپنے دو چار بچے پیدا کر لینے کی بجائے اپنے علاقے کے ہزاروں بچوں کیلئے تعلیمی ادارے بنانے اور سینکڑوں بچیوں کیلئے ہنر سکھانے کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔

ان کو اپنے بچپن اور لڑکپن میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا اس علاقے کے متوسط طبقہ کی آنے والی نسلوں کو نہ کرنا پڑے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بھی ذکر کیا کہ راولپنڈی کے مشہور نالہ لئی جس میں آج دو شہروں کا گندا پانی بہتا ہے وہ کبھی صاف ہوا کرتا تھا، مگر میونسپلٹی والوں نے جب اس علاقے کو ڈمپنگ پوائنٹ کا درجہ دے کر شہر بھر کا کچرا اس کے اردگرد ڈمپ کرنا شروع کر دیا تو اس نالے کے کناروں پر پلنے والی بھینسوں کا سارا گوبر گند کے ہمراہ نالہ لئی میں جانا شروع ہو گیا، رہی سہی کسر ذبحہ خانہ والوں نے جانوروں کے اعضاء اور باقیات کو نالے میں پھینکنے سے پوری کر دی۔ جس سے گند کے ساتھ تعفن میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

اسی تعفن نے نالہ لئی کے کناروں پہ لگے پھولوں کے باغات کی خوشبو کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔ جس کا دکھ مصنف کو بہت زیادہ ہے۔ جن کا بچپن ان باغات میں گزرا۔ اب اس علاقے کی نئی نسل کے بچپن کا آغاز گند سے ہوتا تھا لہٰذا انھوں نے اس علاقے میں صفائی ستھرائی کی مہم چلا کر علاقے کو بچانے کی کوشش کی اور اپنی پوری زندگی اسی میں صرف کر دی۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے　　سب کچھ لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے　　ہارے بھی تو بازی مات نہیں

حمید اللہ نے جس بستی میں آنکھ کھولی اور جہاں آدھی زندگی گزاری آج بھی اسی بستی سے ان کا تعلق قائم ودائم ہے۔انہوں نے اس بستی کو صاف کرنے اور اس میں بسنے والے لوگوں کے معاشی وسماجی حالات کو بدلنے کیلئے ان تھک محنت کی، ساری محنت کے ثمرات کا نچوڑ (کچرے میں جنم) ہے۔جس کے نام سے ہی آپ کے نڈر اور بے باک ہونے کا ثبوت مِلتا ہے۔حمید اللہ نے اس کتاب میں ہر اس کام اور مسئلہ کا تذکرہ کر دیا جس کا تعلق لوگوں کی ترقی اور بہتری سے تھا۔انھوں نے اپنے کاموں کو قلم بند کر کے ایک راہ بھی بنا دی جو اس علاقے کی نئی نسل کے کام آئے گی۔انھوں نے جو خاص کام کیا وہ میری نظر میں یہ ہے کہ دو مختلف الفاظ ''غربت اور غلاظت'' جن کے مفہوم بالکل مختلف ہیں مگر قدر مشترک ہے، ان کی وجہ سے نہ صرف اس علاقے بلکہ پورے ملک میں بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔جس کے خاتمے کیلئے حمید اللہ نے کمر کس لی اور ایک وقت آیا کہ وہ غربت کا تعلق غلاظت سے جوڑنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ انھوں نے غلاظت کو ہی غربت اور پسماندگی کی اصل وجہ قرار دے دیا۔ وہ سمجھتے ہیں غلاظت ذہن کی ہو یا ماحول کی دونوں انسان کی زندگی پہ منفی اثرات مرتب کر کے غربت کا باعث بنتے ہیں۔اس لئے انھوں نے خود گند پھیلانے کی کوشش کبھی نہیں کی بلکہ اپنے علاقے میں گندگی کے خاتمے اور صفائی کا نظام بنانے کی پاداش میں کئی تکالیف اٹھائیں اور علاقے کے بااثر افراد کے ستم سہے۔جس وجہ سے ان کے فلاحی اداروں کو ہتھیا لیا گیا انھیں علاقہ بدر ہونا پڑا اور کئی مقدمات کا سامنا

بھی کرنا پڑا، انہیں سیاسی وسماجی مسائل میں اُلجھایا گیا مگر ہر مشکل کا ڈٹ کر سامنا کیا اور بجائے اپنے کاموں کو روک دینے کے انھوں نے اپنے فلاحی وترقیاتی کاموں کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ایک یونین کونسل سے نکالے جانے کے بعد کئی یونین کونسلوں بلکہ کئی شہروں میں جا کر صحت وصفائی کے منصوبے چلائے اور ملک کو صاف کرنے کو اپنا مشن بنالیا۔

انھوں نے آلودگی اور اور غربت کا خاتمہ ایک ہی نسخے سے کرنے کی ٹھان لی، سُنا ہے دُنیا میں کئی شخصیات ہیں جو ترقی اور کامیابی کی آخری منزل عروج تک پہنچیں ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح کچرے سے ضرور رہا جن میں دو کا ذکر کرتی چلوں ایک امریکہ کے سابق صدر باراک اُبامہ جنہوں نے اپنے علاقے کے صفائی ستھرائی کا نظام قائم کرنے کیلئے جدوجہد کی، اسی طرح ایران کے صدر احمدی نژاد بھی اپنے شہر میں بلدیاتی نظام کا حصہ بنے اور شہر کے میئر بن کے کچرے کے خاتمے کیلئے کوشش کرتے رہے بالآخر انھیں اپنے ملک کی صدارت سونپ دی گئی۔ انھوں نے ملکی سطح پر ترقیاتی کام کئے اور ملک کا بڑا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، جس سے انھیں ملک کی گندگی ختم کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر ترقیاتی کام کرنے کا بھی موقع ملا۔

میری دعا ہے کہ حمید اللہ صاحب نے جس طرح ایک اہم موضوع کوڑا کرکٹ پر کام شروع کیا اور اس کے خاتمے کیلئے زندگی لگادی وہ اس کوشش میں لگے ہیں کہ کوڑے کے خاتمے کے ساتھ ساتھ غربت کا خاتمہ بھی کیا جاسکے،

کوڑا کرکٹ کے نظام کو لوگوں کا ذریعہ معاش بنایا جاسکے تا کہ وہ اپنے ملک کی گردشی معیشت (سرکلرا کانومی) میں حصہ ڈال سکیں۔ جس سے شہروں کے اور ملک کے معاشی اور سماجی حالات اصل میں تبدیل کر کے تبدیلی لاسکیں۔

اللہ انھیں اپنے اس مشن میں کامیاب و کامران کرے اور انکی قلم کو مزید طاقت عطا فرمائے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے اس کتاب کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ میں بھی اس مشن میں انکی ہم سفر رہی ہوں اور انشاءاللہ جب تک زندگی ہے ان کا ساتھ دینے کی ٹھان رکھی ہے کہ وہ اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور رہتی دنیا تک ان کو اچھے الفاظ میں یاد رکھا جاسکے۔ آمین

سمیرا گُل

پیش لفظ

مجھے پتا نہیں تھا کہ بچپن کی طرح بڑھاپا بھی کچرے میں گزرے گا۔ میں جہاں پلا بڑھا وہ میونسپلٹی کا ڈمپنگ پوائنٹ تھا۔ جہاں پر شہر بھر کا کچرا ڈمپ ہوتا تھا۔ 400 گھروں کا ایک خاندان دن بھر اس کچرے میں سے پرانے کپڑے اور جوتے تلاش کرتا رہتا جس سے نہ صرف انہوں نے اپنے گھر کی چار دیواری (پردہ) بنا رکھا تھا بلکہ وہ ان کپڑوں کو دھو کر فروخت بھی کرتے یعنی کچرا ان کا ذریعہ معاش بھی تھا اور پردہ بھی۔ دوسری بڑی فیملی نے ڈمپنگ پوائنٹ کے ارد گرد بھینسیں پال رکھی تھیں اور وہ بھینسوں کیلئے اس کچرے میں سے چارہ علیحدہ کرتے تھے۔ لیکن 327 بھینسوں کا گوبر جگہ جگہ بکھرا رہتا تھا۔ ہم اپنا سارا دن اس گوبر اور کچرے کے درمیان گزارتے۔ میری اہلیہ (سمیرا گل) کا جنم بھی اسی علاقے میں ہوا۔ یہ سارا قصہ نصف صدی پر محیط ہے۔ لیکن عارف حسن نے مجھے صرف 20 دن میں یہ کہانی لکھنے کا ٹاسک دیا ہے، لہٰذا ان 20 دنوں میں صرف 20 سال کی کہانی لکھ سکا ہوں۔ جو آپ کے ہاتھ میں ہے زندگی نے فرصت دی تو باقی بھی کبھی لکھ دیں گے۔

امید ہے ''کچرے میں جنم'' آپ کو پسند آئے گی۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر شہروں کے مضافات سے کچرا ختم ہو جائے تو حمید اللہ اور سمیرا گل کیسے پیدا ہوں؟

حمید اللہ
یوم مزدور 2019

فہرست

1۔	فتح سندھ	16
2۔	اساتذہ کو ترغیب	22
3۔	خیابانِ کشمیر	28
4۔	بنگال کا سفر	37
5۔	بلوچ سردار سے ملاقات	43
6۔	فضل عالم	49
7۔	فکر معاش	55
8۔	تعمیر نو	61
9۔	زندگی کی فیاضی	63
10۔	کچرے میں جنم	68

فتح سندھ

آج ایک ہفتے کے بعد میں سندھ سے لوٹا۔ ضلع نواب شاہ کے ایک تعلقہ سکرنڈ میں IRRC کی بنیا د رکھ دی گئی ہے۔ دراصل ہم نے سندھ کے 141 تعلقہ چیئرمینوں کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں ہم نے (سال نو 2017 کی مبارکباد ارسال کی اور ''IRRC ماڈل'' اسلام آباد کے بارے میں بھی لکھا)۔ جس میں سے صرف ایک تعلقہ کے چیئرمین نے جواب دیا۔ یہ تعلقہ سکرنڈ کے چیئرمین سائیں سید محمد منیر شاہ ہیں۔ (سکرنڈ ضلع نواب شاہ ''شہید بینظیر آباد'' کا ایک تعلقہ ہے جو نواب شاہ شہر سے تقریباً 14 کلومیٹر کے فاصلے پر نیشنل ہائی وے کے کنارے آباد ہے)۔ انہوں نے ہم سے رابطہ کیا اور سکرنڈ کے وزٹ کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم نے شاہ صاحب کی دعوت پر جا کر دیکھا کہ پورے شہر سکرنڈ کا کچرا ہائی وے کے کنارے ڈمپ ہو رہا ہے اور وہاں پر اُسے آگ لگا دی جاتی ہے۔

پہلے مرحلے میں سمیرا گل نے وزٹ کیا اور وہاں کے حالات بتائے۔ دوسرے مرحلے میں میں خود گیا اور بنیادی معلومات اکھٹی کیں، کچھ تجاویز دیں، (جس پر شاہ صاحب نے فوراً عملدرآمد کا حکم دے دیا)۔ ان میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ تمام کچرے کا روزانہ وزن کیا جائے تا کہ معلوم ہو سکے کہ کتنا کچرا روزانہ شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اس طرح روزانہ کچرے کی مقدار معلوم ہونا شروع ہوگئی۔ جس پر حقیقی صورتحال کا اندازہ ہونا شروع ہوا۔ پھر شہر کے نواح

میں ایک ایسی جگہ چُنی گئی جہاں پر کچرے کو پراسیس کیا جاسکے۔یعنی نہ صرف کچرا الگ الگ ہوسکتا ہو بلکہ وہاں پر اس سے کھاد بھی بنائی جاسکتی ہو۔ایسی جگہیں جنوبی پنجاب اور اندرون سندھ میں ہر ٹاؤن کمیٹی کے پاس موجود ہیں جہاں پر وہ شہر بھر کا گندا پانی اکھٹا کرتے ہیں اور پھر کسی دریا یا نالے میں پھینک دیتے ہیں۔ یہاں پر زمین بھی ہوتی ہے گھر بھی اور سٹاف بھی۔ جہاں بڑی آسانی سے گندے پانی کی طرح کچرا بھی اکھٹا کر کے ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ چیئرمین صاحب نے ایسی ہی ایک جگہ پر ایک شیڈ، پلیٹ فارم اور چار دیواری بنوا دی اور ہم نے وہاں کام شروع کر دیا۔سمیرا نے سینیٹری ورکروں کے لئے 3 دن کی تربیت (Training) کا شیڈول تیار کیا اور اُس کا انتظام کیا جس کے بعد ایک ہزار گھروں سے کچرا اکھٹا کرنے کیلئے صفائی مہم شروع کر دی گئی۔ ہم نے اپنے ماڈل کی ریڑھیاں ان ایک ہزار گھروں کے لئے لگا دیں اور کچرا مقررہ جگہ پر آنا شروع ہوگیا۔ بعد ازاں ہفتہ صفائی منایا گیا۔ کونسلروں کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔سکول کے بچوں کو ترغیب دلائی گئی، صحافیوں نے لکھنا شروع کیا ،غرض موبلائیزیشن کے تمام حربے آزمائے گئے اور عملی کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔

شاہ صاحب کمال کے آدمی ہیں۔اپنے آستانے کے گدی نشین ہیں اور اپنے شہر کے لئے کچھ کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں۔ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کا بیٹا جو کہ لندن سے پڑھ کہ آیا ہے وہ بھی رفاہی امور میں بہت دلچسپی لیتا ہے ۔ انہوں نے مجھے درگاہ پر ٹھہرنے کا موقع دیا۔ان کے مریدین سائیں کے مہمان کی

حیثیت سے میری خدمت کرتے رہے۔اور ہر گھنٹے کے بعد چائے پانی پیش کرتے۔رات کوشاہ صاحب بھی آ گئے۔انہوں نے کچھ اپنے بارے میں بتایا اور کچھ میرے بارے میں پوچھا۔خوش ہوئے کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور اب مل کر اس شہر کو سنواریں گے۔میں نے بھی ان کی بات سے اتفاق کیا۔

ڈاکٹر اختر حمید خان کے شاگردوں نے تنظیموں کا ایک نیٹ ورک بنا رکھا ہے۔جو کمیونٹی ڈویلپمنٹ نیٹ ورک (CDN) کہلاتا ہے۔اس نیٹ ورک کی میٹنگ سال میں 3 بار ہوتی ہے۔میں جب گذشتہ بار CDN میں گیا۔تو وہاں موجود لڑکوں سے پوچھا کہ وہ کہاں کہاں سے آئے ہیں۔جس پر 2،3 لڑکوں نے بتایا کہ وہ نوابشاہ سے ہیں۔میں نے ان سے اجلاس کی کاروائی کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو ان تین نوجوانوں میں سے ایک (اعجاز کھیریو) سکرنڈ کے قریب کا رہنے والا تھا۔جس کو میں نے کام کے لیے آمادہ کیا تو وہ راضی ہوگیا۔ میں نے اس کو سالڈ ویسٹ مینجمنٹ سینٹر سکرنڈ کا انچارج بنادیا۔اس نے اپنے لئے ایک نائب (ASSISTANT) گل شیر بھی رکھ لیا۔ اسطرح ہماری ٹیم تشکیل پا گئی۔ہم نے جس وارڈ سے کام شروع کیا اس کا کونسلر (اللہ یار) پہلی بار کونسلر منتخب ہوا ہے۔جو نہ صرف نوجوان ہے بلکہ کچھ کرنے کا خواہشمند بھی ہے۔وہ مجھ سے ملا۔اور اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت بھی دی میں نے موقع غنیمت جانا اور اس کی پیشکش فوراً قبول کر لی۔کیونکہ اس آفر کی وجہ سے میں عوام کے زیادہ قریب رہ سکتا تھا۔اور مجھے زیادہ کام کرنے اور سیکھنے کا موقع مل

سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے جہاں مجھے ٹھہرایا وہ ایک موبائیل فون کمپنی کے ٹاور کے ساتھ بنا ہوا کمرہ تھا۔ جس میں بجلی بھی نہیں جاتی تھی اور مجھے رہنے میں بھی آسانی تھی میں نے اعجاز کو بھی اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دی۔ اگر چہ میں کچھ دن اعجاز کے اوتاک پر بھی ٹھہرا رہا۔ بہر حال میں نے شہر کے باقی کونسلروں سے بھی رابطے کیئے۔ جس میں فیض خانزادہ سے بھی کئی بار ملا جو نہ صرف بہت اچھی چائے صرف دو منٹ میں پیش کرتا تھا بلکہ بسکٹ وغیرہ بھی ہمراہ ہوتے، منرل واٹر بھی پلاتا۔ جبکہ اس سے ملاقات کے دوران کبوتروں کا شوق الگ سے پورا ہو جاتا تھا۔ اس طرح ایک ٹیم بھی بن گئی، سینٹر بھی بن گیا اور کونسلروں سے سلام دعا بھی شروع ہوگئی، لیکن کچرے کی مقدار کم آرہی تھی۔ ورکر ایک چکر لگا کر 10، 20 گھروں کا کچرا لاتے اور مجھے بتاتے کہ جی ہم 100 گھروں سے کچرا لے آئے ہیں۔ مجھے کچرے کی مقدار کا اندازہ تھا۔ وہ شروع میں گھروں اور ڈمپ کا کچرا مکس کر کے بھی لے آتے، جس میں سے بمشکل سے 100 کلو سبزی یا پھلوں کے چھلکے نکلتے۔

میں نے ٹاؤن کمیٹی کے موجودہ نظام کا جائزہ لیا۔ اور مختلف جگہوں پر پڑے ہوئے کنٹینرز کا وزٹ بھی کیا۔ 8 میں سے 4 کنٹینرز میں ایسا کچرا ملا جس کو معمولی صفائی کے بعد کھاد بنانے کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ کنٹینرز روائتی سستی کی وجہ سے مزدا ڈرائیور نہیں اُٹھاتے تھے۔ جس کی وجہ سے لوگ کچرا کنٹینرز کے اندر پھینکنے کے بجائے باہر پھینک جاتے تھے لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہم نے ایک مقامی کونسلر کو موبلائز کیا۔ پہلے تو وہ آمادہ نہیں ہو رہا تھا پھر

اس نے ایک شرط رکھی کہ اگر کچرا روزانہ اُٹھایا جائے تو لوگ اس میں پھینکیں گے۔ہم نے ٹاؤن ملازمین سے بات کی انہوں نے کہا کہ ہم ہر روز کچرا اُٹھائیں گے۔اس طرح باقی جگہ بھی بات ہوئی اور بڑی گاڑیوں کے ذریعے کچرا سنٹر میں منتقل ہونے لگا۔چنانچہ 3 دن میں 20 سے 30 ٹن کچرا جمع ہو گیا۔

اس کے علاوہ 2 گاڑیاں کرائے پر بھی لے لی گئیں۔جو گھروں سے کچرا اٹھا کر سینٹر تک لاتیں۔اور سبزی منڈی کا کچرا بھی لیکر آتی رہیں۔اس کے علاوہ شہر میں گنے کا رس بیچنے والے کافی سارے ٹھیلے تھے ان کا کچرا بھی الگ سے آنا شروع ہو گیا۔اس طرح 5 سے 7 ٹن کی مقدار میں کچرا روزانہ شہر سے ہمارے سینٹر میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔جس سے کھاد بننے لگی۔سینٹر کے کباڑ کو شہر میں فروخت کرنے کے لئے ہم نے ایک نوجوان راشد سے بات کی اس نے نہ صرف ریٹ دیئے بلکہ کہا کہ میں خود خریداری بھی کروں گا۔ریڑھیوں پر آنے والے کچرے میں سے 20 سے 25 فیصد کباڑ ہوتا ہے۔ہم اس کی الگ ڈھیری لگا رہے تھے جو ہر ہفتے فروخت کیا کرتے تھے اس سے کبھی 300 کبھی 500 روپے آمدن ہو جاتی تھی۔کباڑ میں کپڑوں اور جوتوں کی مقدار زیادہ تھی جو راشد نہیں خرید رہا تھا۔جسکے لئے ہم نے اینٹوں کے بھٹے والے سے بات کی جو 60 روپے من لے جاتا رہا۔

لیکن اس تمام نظام میں ورکر کی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ چوری چھپے کباڑ باہر ہی فروخت کر آتے تھے اس وجہ سے ہم نے گل شیر کو کہا کہ آئندہ وہ

سینٹری ورکرز سے کباڑ خود خریدے اور 25 فیصد اپنا منافع رکھے۔ اس طرح کباڑ کی مقدار میں اضافہ بھی ہو گیا اور سینٹری ورکرز بھی دلچسپی لینے لگے۔ نیز سینٹر بھی معقول انداز میں کام کرنے لگا۔ لیکن کچرے کی مقدار کم آ رہی تھی اور صفائی اچھی نہیں ہو رہی تھی۔ شاہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کام کیسے بہتر ہو گا میں نے کہا کہ اگر ایک لاکھ روپے فی وارڈ آپ ماہانہ دے دیں تو ہم اس کام کو مزید بہتر کر سکتے ہیں انہوں نے اس شرط کو منظور کرتے ہوئے ہمیں پانچ وارڈز کو ٹھیک کرنے کی اجازت دے دی لیکن 3 ماہ کے بعد اس کنٹریکٹ پر Audit Objection لگ گیا کہ آپ ایک کام کیلئے دو لوگوں کو ادائیگی نہیں کر سکتے جس سے کام بند ہو گیا۔ شاہ صاحب بھی دھن کے پکے ہیں انہوں نے اگلے سال کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی جھاڑو اور کوڑے کا کام الگ دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہمیں ٹینڈر میں حصہ لینے کو کہا، جو ہم نے کم ریٹ دے کر حاصل کر لیا۔ اس طرح پورے شہر کے کچرے کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری ہمیں سونپ دی گئی، ہم نے JS بینک سے قسطوں پر 8 گاڑیاں خرید کر سکرنڈ شہر کی صفائی پر لگا دیں۔ اس طرح تقریباً ہر وارڈ میں ایک گاڑی کوڑا اُٹھانے پر لگ گئی اور روزانہ کی بنیاد پر کچرا اکٹھا ہونے لگا۔ اس کچرے کی خاصی مقدار IRRC سکرنڈ میں استعمال ہو رہی ہے اور ماہانہ 500 بیگ کھاد بن رہی ہے جو مختلف کسانوں کو فصل میں استعمال کرنے کیلئے دی جاتی ہے۔ اس طرح کر کے میرے ذہن میں محمد بن قاسم بننے کا خواب پورا ہو گیا اور ہم نے سندھ فتح کر لیا۔

اساتذہ کو ترغیب

ڈاکٹر اختر حمید خان کی سوچ کے دو مکتبِ فکر School of Thought بن گئے۔ایک گروپ مرکزیت کا قائل (Centralist)۔ جبکہ دوسرا گروپ مرکز گریز(Decentralize) نظریئے کا قائل ہے۔ یہ دونوں گروپ اپنی اپنی سوچ کے مطابق کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔اور کامیابیاں سمیٹ رہے ہیں۔

ہم بنیادی طور پر مرکز گریز(Decentralize) والے گروپ کے ساتھ ہیں جن کی سوچ ہے کہ مقامی سطح پر چھوٹے چھوٹے گروپوں میں خودمختاری کے ساتھ کام کیا جائے اور آزادی کے ساتھ کام ہو۔جس میں رسمی تعلیم کی قید و بند نہیں ہے۔بس ڈاکٹر صاحب کے کام کو سمجھنا اور آگے بڑھانا لازم ہے۔ہم نے سمجھا،سیکھا اور سکھا رہے ہیں۔اگر چہ اس میں مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات خود اپنے وجود کے خاتمے تک بھی بات پہنچ جاتی رہی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات تو مر کر بھی زندہ ہوئے۔لیکن اگر آپ نے زندہ رہنے کا گُر موت سے سیکھا ہو تو پھر موت مشکل میں پھنس جاتی ہے۔

ہمارے اس گروپ کے سربراہ عارف حسن ہیں۔اگر چہ ہم پروین رحمٰن اور انور راشد کی بھی فکری اولاد میں سے ہیں لیکن جب انہوں نے ہمیں ناخلف قرار دے کر عاق کر دیا اور قابل گردن زدنی گردانا۔تب یہ عارف حسن ہی تھے جو ہمارے لئے ایدھی بنے اور انہوں نے ہمارے لئے جھولہ آگے بڑھا دیا کہ ''مارو

نہیں اس میں ڈال دو''۔اس طرح ہم عارف حسن کے گہوارے میں پل کر جوان ہوگئے ۔حقیقی بات یہ ہے کہ ہمارے اپنے والدین نے ہمیں زندہ رہنے کیلئے اتنی سپورٹ نہیں کی جتنی عارف حسن نے کی ۔وہ مسلسل پندرہ سال تک ہماری مالی اورفکری معاونت کرتے رہے۔اورآج بھی راہنمائی کررہے ہیں۔ اگروہ نہ ہوتے تو شاید آج ہم بھی نہ ہوتے ایک وقت ایسا آیا کہ ہمارے پاس کھانے پینے کیلئے پیسےنہیں بچے ہم نے ان سے استدعا کی تو انہوں نے ہمیں پچاس ہزار کی مالی معاونت کی ۔اکثر اوقات ہمارے پاس کراچی آنے جانے کیلئے کرایہ نہیں ہوتا تھا تو ہم عارف صاحب کے پاس جاتے ۔وہ اسرار کو کہتے۔ ''اسرار اندر پانچ سوڈالر پڑے ہیں انکو دے دو۔اوروہ ہمیں کہتے اس کا حساب کتاب رکھنا بہرحال قصہ مختصر عارف حسن کی رہنمائی اور مالی معاونت میں بیس سال کا طویل سفرہم نے کامیابی سے طے کیا۔2010ء کے لگ بھگ عارف حسن نے ایک ایک کرکے اکثر اداروں سے استعفیٰ دیناشروع کیا تو ہمارے ادارے کی چیئرمین شپ سے بھی مستعفی ہوگئے۔البتہ ہماری درخواست پر بورڈ ممبری برقراررکھی ہمارے نئے چیئرمین ایک اورمہربان فیاض باقر بنے۔

2009-10 میں نہ صرف عارف حسن نے ہمارے سر سے ہاتھ اُٹھا لیا، بلکہ ہمارے ڈونر نے بھی ہماری 15 سالہ رفاقت ختم کردی اور ہمارے لئے ایک بار پھر ایسے حالات پیدا ہوگئے ۔کہ ہم شاید مزید ڈیویلپمنٹ کے کام نہ کرسکیں۔اورتلاشِ معاش شروع کردیں۔اس کی تفصیل آگے چل کرفکرمعاش

میں بیان کروں گا۔ بہرحال پانچ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اساتذہ کی تعلیم اور اپنی دانش کے بل پر ایک ایسا ماڈل تیار کرلیا جو ہم نے عارف حسن کو 2016 میں دکھایا۔ جب انہوں نے یہ ماڈل (IRRC) دیکھا تو بولے کہ میں آپ لوگوں کو انگلی سے لگا کر چلاتا رہتا تو شائد آپ لوگ یہ ماڈل نہ بنا پاتے۔

عارف حسن نے نہ صرف خود یہ ماڈل پسند کیا۔ بلکہ انہوں نے مزید لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ ہم نے سندھ کے اندر اپنے کام کے وزٹ کا وعدہ بھی ان سے لے رکھا ہے۔ وہ ہمارا کام دیکھنے اندرون سندھ بھی ضرور آئیں گے اور یقیناً رہنمائی بھی فرمائیں گے۔

کچرے کو ٹھکانے لگانے کی ترغیب ہمیں فیاض باقر صاحب نے 1997ء میں دی تھی جب وہ راولپنڈی میں سویپ پراجیکٹ شروع کر رہے تھے۔ وہ خود پہلے سے تین چار پائلٹ پراجیکٹ کر چکے تھے۔ جن میں سے ہم نے بھی دو تین سو گھروں کا ایک پائلٹ پراجیکٹ کیا تھا۔ جس میں ہم گھر گھر سے کچرا اکھٹا کر کے لاتے اور الگ الگ کر کے فروخت کرتے تھے۔ یہ ایک سال کا پائلٹ کر کے ہم کچھ اور کاموں میں لگ گئے لیکن 2008 میں جب سپلائی لائن ٹوٹی تو ہم نے یہ نسخہ دوبارہ نکالا اور ایک جگہ آزمایا۔ جو کامیاب رہا۔

UN والے جب IRRC ہمارے حوالے کر رہے تھے تو اس تقریب میں فیاض باقر بھی موجود تھے۔ وہ بہت خوش تھے کہ ہم لوگوں نے ایک کامیاب ماڈل کی بنیاد رکھ دی تھی۔ فیاض باقر اگرچہ ان دنوں ملک سے باہر ہیں لیکن وہ

مسلسل ہمارے ساتھ شفقت فرماتے ہیں اور ہماری رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

جب 1996ء میں پہلی مرتبہ ہم نے Orangi Pilot Project (OPP) کا وزٹ کیا۔ تو حفیظ آرائیں مرحوم نے ہمیں سلائیڈ پروجیکٹر پر بریفنگ دی اور جاوید نے ہمیں سینٹیشن اور سیوریج لائن کی عملی تربیت دی۔ بعدازاں وہ ہمارے پاس راولپنڈی آئے اور ہمیں پہلی سیوریج لائن بھی ڈال کر دی۔

حال ہی میں جب میں نے اندرون سندھ (سکرنڈ) میں کام شروع کیا تو جاوید بھائی کو بھی بریفینگ دی (گذشتہ سال CDN کی میٹنگ کے دوران انہوں نے IRRC اسلام آباد کا ماڈل بھی وزٹ کیا تھا)۔ انہوں نے سلیم علیم الدین کے ہمراہ سکرنڈ ہریالی سنٹر کا وزٹ کیا تو بہت خوش ہوئے اور مقامی لوگوں کو اسلام آباد ماڈل دیکھنے کی ترغیب دی۔

اس کے بعد ہم نے جب OPP کا وزٹ کیا تو سلیم بھائی سے استدعا کی کہ وہ ہماری راہنمائی جاری رکھیں تا کہ ہم سالڈ ویسٹ کے اس ماڈل کو سندھ میں مزید آگے بڑھا سکیں اور لوگوں کو کچرے کے مضر اثرات سے نجات دلوا سکیں۔ انہوں نے ہمیں اپنے ممکنہ تعاون کی دوبارہ یقین دہانی کروائی۔

اس کے علاوہ ہم نے OPP میں انور راشد سے بھی ملاقات کی اور انہیں بھی ہریالی سنٹر سکرنڈ وزٹ کرنے کی دعوت دی اس کے بعد ہم اختر خان سے ملے اور انہیں بتایا کہ سینٹری ورکرز ہمارے معاشرے کا پسماندہ ترین طبقہ ہے۔ ان کی معاشی و معاشرتی پسماندگی کے علاوہ ان کی رہائشی سہولیات کی

صورتِ حال بھی ناگفتہ بہہ ہے۔

اس لئے ہماری یہ خواہش ہے کہ تسنیم صدیقی صاحب کے آئیڈیا ''خدا کی بستی'' کی طرز پر سکرنڈ میں بھی سینیٹری ورکرز کیلئے گھر بنائے جائیں۔اس سلسلے میں تسنیم صدیقی صاحب جب گذشتہ دنوں اسلام آباد تشریف لائے تو اُن سے بھی بات ہوئی تھی لیکن اگر آپ سکرنڈ کا وزٹ کریں اور اس سلسلے میں ہمیں تجاویز دیں کہ اس امر کو قابل عمل کیسے بنایا جاسکتا ہے۔تو ہماری کاوش مزید بارآور ہو سکے گی۔

ہمارے ایک اور مدبر اُستاد ایڈون سیمسن ہیں اُن سے ہمیں 1993 میں نسرین اظہر نے ملوایا تھا۔وہ اُن دنوں فیڈرل گورنمنٹ سکولوں کے ٹیچرز کو ٹریننگ دے رہے تھے۔ان دنوں میرا بھی ایک کمیونٹی سکول تھا۔جس میں، میں کچرا چننے والے بچوں کو پڑھاتا تھا۔انہوں نے ہمارے ٹیچرز کو بھی تربیت فراہم کی بعدازاں فیاض باقر نے ان کا اور محبوب صدا کا نام ہمارے ادارے کے بورڈ ممبر کے لئے تجویز کیا۔اور وہ ہمارے بورڈ ممبر بن گئے۔

ہم نے ایک بورڈ میٹنگ IRRC میں رکھی اور ان کو بریفنگ بھی دی۔وہ حیران رہ گئے۔اور بولے کہ تم لوگ اتنا بڑا کام کررہے ہو۔انہوں نے ٹیئر فنڈ(Tear Fund) کے اشرف صاحب کو موبلائز کیا اشرف صاحب نے پورے سندھ اور یورپ، برطانیہ تک بات پہنچادی اسطرح ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے نئے لوگوں نے اسے پیشہ ورانہ شکل دے دی۔

ہم نے اسلام آباد میں کامیاب ماڈل چلالیا۔جہاں دو ہزار دو سو گھروں

سے پانچ ،سات ٹن کا روزانہ کچرا نہ صرف اکھٹا کرتے ہیں بلکہ اسے پراسس بھی کرتے ہیں۔لیکن اب اس کو سرکاری مدد یا مرکزیت والے نیٹ ورک کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں مرکزیت ،تقسیم کار اور سرکاریہ تین ادارے ہیں۔یعنی OPPN،RSPاور لوکل گورنمنٹ لیکن دونوں غیر سرکاری اداروں کی بیوروکریسی بھی ایسی ہی ہے جیسی سرکاری اداروں کی ۔وہ ہمارے جیسے ماڈل کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

سمیرا گزشتہ دنوں ایکومن نیٹ ورک کے اجتماع میں نیروبی گئی تھیں۔ وہاں پرNRSPکے چیئرمین شعیب سلطان خان سے ملاقات ہوئی۔جن کو سمیرا نے آمادہ کیا کہ وہ ہمارا ماڈل دیکھیں۔شعیب صاحب نے کہا کہ ماڈل NRSPکے بورڈ میں پیش کرو۔جو پیش کیا گیا اور بورڈ نے پسند بھی کیا۔مسلسل اسرار پرشعیب صاحب نے یہ ماڈل وزٹ کیا۔بلکہ ڈاکٹر اختر حمید خان کی بیٹی ڈاکٹر عائشہ کو بھی ساتھ لائے۔اورانھوں نے اس کام کو ڈاکٹر صاحب کے کام کا حقیقی رخ قرار دیا اوراس بات کا اعادہ کیا کہ میںNRSPکے نیٹ ورک میں دوستوں سے بات کروں گا۔

اسطرح لوکل گورنمنٹ کے DGنے بھی اس پروگرام کو پنجاب میں چار جگہ رپلیکیٹ(Replicate) کرنے کا وعدہ کرر کھا ہے ۔اس مختصر مدت میں ہم اپنے اساتذہ کواپنے کام کی طرف کتنا راغب کر پائے ہیں۔اس کا اندازہ آپ مندرجہ بالا روداد سے کر سکتے ہیں۔

خیابانِ کشمیر

جرنیلی سڑک کے کنارے خیابان کشمیر G-15 اسلام آباد کی ایک آبادی ہے۔جس میں ہم نے کچرا اٹھکانے لگانے کا انتظام وانصرام کر رکھا ہے۔ اس آبادی کی بنیاد 80 کی دہائی میں رکھی گئی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہاں اچھے خاصے گھر بن چکے ہیں۔2000ء کے بعد اس آبادی میں بہت زیادہ ترقی ہوئی، پراپرٹی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا۔اس علاقہ کی تعمیر وترقی ایک کوآپریٹوسوسائٹی کے زیر انتظام ہو رہی ہے۔ ہر تین سال بعد اس سوسائٹی کے باقاعدہ الیکشن ہوتے ہیں جس سے نئی انتظامیہ وجود میں آجاتی ہے۔اس سوسائٹی کی بنیاد تو شاید عام طبقے کیلئے رکھی گئی تھی۔لیکن اب اس میں متمول طبقہ آباد ہے۔کیونکہ اب پلاٹوں کی قیمت کروڑوں میں ہے۔موٹروے، جی ٹی روڈ اور راولپنڈی کے قریب ہونے کی وجہ سے بھی اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا زیادہ ہے۔اس میں کُل (4600) چھیالیس سو پلاٹ ہیں لیکن آباد گھر 2200 کے قریب ہیں یہ گھر 7 سے 10 مرلے اور ایک کنال تک کے ہیں۔ہم روزانہ 3 سوزکیوں اور 6 ورکروں کی مدد سے گھر گھر سے کچرا وصول کرتے ہیں اور IRRC پہنچاتے ہیں۔ جہاں 3 ورکر اس کو الگ الگ کرتے ہیں۔اور اس کو 3 حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے جو 60 فیصد ہوتے ہیں کباڑ جو 25 فیصد ہوتا ہے۔اور Reject Waste جو کہ 15 فیصد ہوتا ہے

سبز کوڑے سے ہم کھاد بنا لیتے ہیں۔جس کے لئے 12 بکس بنائے گئے ہیں۔ ایک بکس ہفتے میں بھر جاتا ہے۔یعنی 15 ٹن کوڑا ایک بکس میں آتا ہے اور 45 دن تک ہم اسے الٹ پلٹ کرتے ہیں۔اس کے بعد ایک اور بکس میں ڈال دیتے ہیں۔جہاں 15 دن رہتا ہے۔اسطرح 60 دن بعد نکال کر چھان لیتے ہیں۔اور تھیلوں، بوریوں اور لفافوں میں پیک کر کے نرسری والوں، یا کسانوں کے آگے 15 سے 20 روپے فی کلو میں فروخت کر دیتے ہیں۔

سبز کچرے کے اندر تقریباً 90 فیصد پانی ہوتا ہے۔جو لیچٹ کہلاتا ہے۔ اس کو ہم نالیوں کے ذریعے ایک بکس میں کی مدد سے اکھٹا کرتے ہیں،اور بوقتِ ضرورت دوبارہ اس پر سپرے کرتے یا بائیوگیس پلانٹ میں ڈال دیتے ہیں۔ ویسے اسکو براہ راست (Dilute) کر کے کھاد کے طور پر کھیتوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔اسطرح 100 کلو سبز کچرے سے 10 کلو کھاد بنتی ہے۔جس کا ٹیسٹ ہم نے نیشنل ایگری کلچر ریسرچ سینٹر (NARC) سے کرایا ہے۔اس ٹیسٹ کے نتائج بہت بہتر ہیں۔اس سے ہمیں بہترین قدرتی کھاد بھی مل رہی ہے اور 60 فیصد کوڑا بھی ٹھکانے لگ جاتا ہے۔اس پلانٹ میں روزانہ 3 ٹن سبز کوڑے کو پروسیس کرنے کی گنجائش ہے۔ہم روزانہ اس کا ٹمپریچر بھی لیتے ہیں۔ عموماً باہر جو ٹمپریچر ہوتا ہے۔شروع کے دنوں میں باکس کے اندر کا درجہ حرارت اس سے ڈبل ہوتا ہے۔جو آہستہ آہستہ کم ہوتا ہے اور 45 دن بعد کھاد تیار ہو جاتی ہے۔

راولپنڈی اور اسلام آباد کے مضافات میں ہوٹلوں میں گوشت کی

ضرورت پوری کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے اسلام آباد کے نواح میں بھڑیں پال رکھی ہیں۔ یہ بھیڑیں پالنے والے ویسٹ سے سبز چارہ نکال کر لے جاتے ہیں ان سے ہم نے بات کی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہزار روپے فی ٹن ہم سے سبز کچرا لیکر جاتے ہیں۔ سبز کچرے کو خشک کر کے بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ یا پھر کریش کر کے بھی جانوروں کی خوراک بنائی جاسکتی ہے۔

ہمارے پاس دوسرا قیمتی کچرا کباڑ ہے۔ جو کہ کُل کچرے کا 25 فیصد ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایک کباڑی کو ٹھیکہ دے رکھا ہے جو روزانہ کچرے کو الگ (Segregate) کر کے تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ سبز کوڑا (Organic Waste)، کباڑ (Recyclable waste) اور ناکارہ کچرا (Reject Waste)۔ کباڑیہ کباڑ خود لے جاتا ہے اور سبز کوڑا ہمارے باکس میں ڈال دیتا ہے اور ناکارہ کچرے کو ڈمپنگ سائٹ پر بجھوا دیتا ہے اور ہمیں 40 تا 50 ہزار روپے ماہانہ معاوضہ بھی دیتا ہے اور اتنی ہی رقم الگ الگ کرنے والے ورکرز کو بطور معاوضہ بھی دیتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ وہ اپنے گھر بھی تقریباً اتنی ہی رقم لے جاتا ہوگا۔

تیسرے اور آخری قسم کا ویسٹ ناکارہ کچرا ہے جس میں پیمپر، سینیٹری پیڈ، دودھ کے ڈبے، گندے شاپر، مٹی، پتھر وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ تقریباً 15 فیصد ہوتا ہے۔ اس کو ٹھکانے لگانے کیلئے ہم سوزوکی میں بھر کر CDA کی ڈمپنگ سائیٹ پر پھینک دیتے ہیں۔ اگر چہ اس کو جلانے کیلئے بھی استعمال کیا جاسکتا

ہے۔لیکن اس کے لئے زیادہ مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ہم اس پر تحقیق کر رہے ہیں کہ اس کا بھی کوئی حل نکال سکیں اور شاید عنقریب ہی کوئی حل نکل آئے گا۔جیسے شاپر سے اینٹ بنائی جاسکتی ہے۔اسی طرح پیمپر کو دھو کر روئی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔بہر حال ابھی ان سب پر خرچ بہت زیادہ ہے اور آمدن بہت کم ہے۔لہٰذا اس کو زمین کی بھرائی کیلئے استعمال کیا جارہا ہے۔جو CDA کر رہی ہے۔ہم اس پلانٹ پر مزید چھوٹے چھوٹے تجربات بھی کر رہے ہیں۔جیسے ہم نے دیسی مرغیاں بھی پال رکھی ہیں جو گھروں سے آنے والی بچی کچی بریانی پر پل رہی ہیں اور ان کا ویسٹ ہم کھاد میں استعمال کر رہے ہیں۔جس سے کھاد زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے۔اور جو کام ہم 60 دن میں کرتے ہیں وہ مرغیاں 8 گھنٹے میں کر کے ہمیں دے دیتی ہیں۔یعنی ہم 60 دن میں کھاد بناتے ہیں جبکہ مرغیاں 8 گھنٹے میں کچن ویسٹ کو کھاد میں تبدیل کر دیتی ہیں۔جبکہ گوشت اور انڈوں کی سپلائی بھی جاری رہتی ہے۔یعنی یہ ویسٹ کو گوشت میں تبدیل کرنے والا پلانٹ ہے۔

اس کے علاوہ دودھ اور جوس کے ڈبوں میں پودے اُگا کر فروخت بھی کیے جاسکتے ہیں۔اور اپنے پلانٹ کے اردگرد بھی لگائے جاسکتے ہیں۔پلانٹ کی چھت سے جمع ہونے والے بارش کے پانی کو بھی محفوظ کیا جاتا ہے۔جو پلانٹ کی صفائی، پودوں کی کیاریوں اور باتھ روم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔اردگرد سبزیاں بھی اُگائی گئی ہیں۔جو قدرتی کھاد پر پلنے والی بہترین سبزی ہے۔

اس پلانٹ پر کام کرنے والے تمام ورکر خوش ہو کر یہ سبزیاں پکاتے اور

کھاتے ہیں ای گارڈ اپنے ورکروں کو معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ سوشل سیکورٹی سے میڈیکل کی سہولت بھی مہیا کرتا ہے۔ ہمارے کارکن چھت کے نیچے کام کرتے ہیں ان کو پینے کے لئے ٹھنڈا پانی اور واش روم کی سہولت کے علاوہ محفوظ وردی، ماسک، دستانے وغیرہ بھی مہیا کیئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ضرورت کی اکثر چیزیں ان کو کچرے سے مل جاتی ہیں۔ جن سے انکے گھر بھر گئے ہیں۔ میرا موبائیل فون جو کہ میں نے 3 سال پہلے 25 ہزار روپے کا خریدا تھا اب اس طرح کے فون کچرے میں آجاتے ہیں۔ میرا بچہ وصال میرا مذاق اُڑاتا ہے۔ ''پاپا اب فون تبدیل کرلو'' یہ اب کچرے میں آرہا ہے۔ ورکر جلانے کیلئے لکڑی بھی یہاں سے لے کر جاتے ہیں۔ کچھ اپنے گائے بکری کے لئے چارہ بھی مفت لے جاتے ہیں۔ مزے ہی مزے ہیں۔ جوتے، کپڑے اور بہت کچھ ان کو اس کچرے سے ملتا ہے۔

حمید گل استاد کا تو منہ بھی چلتا رہتا ہے۔ ورکرز اس سے مذاق کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے گرین ویسٹ کم ہوتا ہے۔ ہمارے اس پلانٹ پر مہمان تسلسل سے آتے رہتے ہیں، نہ صرف ملکی بلکہ بیرون ملک سے بھی لوگ دیکھنے کیلئے آتے رہتے ہیں۔ جن کیلئے ہم نے الگ سے ایک کمرہ تعمیر کروایا ہے جہاں ان کو بریفینگ دی جاتی ہے اور چائے، پانی، کھانا وغیرہ بھی چلتا رہتا ہے۔ لوگ اس کام کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اسطرح یہ ایک ٹریننگ سنٹر بھی بن گیا اور کاروباری مرکز بھی۔ جو نہ صرف کارخانوں اور کھیتوں کو آباد کرتا ہے۔ بلکہ لوگوں کے ذہنوں

میں بھی تبدیلی لا رہا ہے۔ کہ کچرا، کچرا نہیں ہے۔ یہ وسائل ہیں (Trash is Cash) جو قیمتی ہیں۔

یہ سب دیکھ کر پڑھے لکھے نوجوان بھی اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور اب آہستہ آہستہ یہ ایک وائٹ کالر جاب بن گیا ہے۔ جو نہ صرف خدمت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ بلکہ لوگوں کو مالا مال بھی کر رہا ہے۔ کیونکہ ہر گھر سے روزانہ 3 سے 4 روپے کا کچرا نکلتا ہے۔ جو پہلے شاید ضائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب اس سینٹر کی مدد سے کام میں لایا جا رہا ہے۔

دو تین سال پہلے ہم نے اس ایریا (G-15) میں سروس شروع کی تھی۔ اس وقت ہم کچرا ایک جگہ اکھٹا کرتے، کام کی چیزیں نکال کر بیچ دیتے اور باقی سوسائٹی کے اندر ہی کسی ناہموار جگہ پر فلنگ کے لئے پھینک دیتے تھے۔ کچھ عرصے بعد سوسائٹی والے اس پر ٹریکٹر چلا کر اس کو ہموار کر دیتے۔

ہمارے رابطے UN سے موجود تھے اور وہ ہمارے سابقہ کام سے واقف بھی تھے، وہ کہیں پر اسطرح کا سنٹر بنانا چاہ رہے تھے۔ ہم نے سوسائٹی سے بات کی انہوں نے شروع میں جگہ دینے سے انکار کر دیا، لیکن بنگال وزٹ کرنے کے بعد انہوں نے پلاٹ دے دیا۔ جو ڈیڑھ کنال رقبے کا ہے اور STP کے قریب ہے۔ UN نے سینٹر کی تعمیر کے لئے فنڈ کیا اس طرح یہ سینٹر بن گیا۔

سینٹر کا باقاعدہ افتتاح کیا گیا۔ جس کے لئے مریم اورنگزیب نے آنا تھا جو کہ MOCC کی چیئر پرسن تھی۔ لیکن شاید انہوں نے اس کو اپنے شایانِ شان

نہیں سمجھا اور مرکزی تقریب جو کہ اسلام آباد میں منعقد ہوئی تھی وہاں سے ہی واپس چلی گئی۔ بہر حال UN کے نمائندے موجود تھے اور بڑی خوشی سے 17 ستمبر 2015 کو سینٹر کا افتتاح کر دیا گیا۔ MOCC کی نمائندگی عرفان طارق صاحب نے کی جو کہ آجکل DG ہیں۔

افتتاح کے بعد UN نے باقاعدہ ایک معاہدے کے ذریعے یہ سینٹر ہمارے حوالے کیا اور امید ظاہر کی کہ ہم اسکو کامیابی سے چلائیں گے۔ اگر چہ ان کو کچھ خدشات تھے کہ شاید یہ چل نہیں پائے گا اور شروع میں ہمیں بھی بہت تنگ کیا۔ کیونکہ انکا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن ہمارا تو جنم ہی کچرے میں ہوا تھا۔ ہم ان کی جلی کٹی باتیں سنتے رہے اور اپنے کام میں لگے رہے۔ ایک دفعہ جب UN والے وزٹ پر آئے تو ہم کمپوسٹ بکس میں سبزی ڈال رہے تھے۔ جو مرکز میں موجود سبزی فروش نے ہمیں ویسٹ میں دی تھی وہ سمجھے کہ شاید ہم یہ سبزی خرید کر لائے ہیں۔ جس پر ہمیں سخت سنائیں۔ اسی طرح بعد میں ایک اور صاحب کو انہوں نے کنسلٹنٹ مقرر کیا۔ جو اپنی نوکری برقرار رکھنے کیلئے ہر وقت ہم پر تنقید کرتا رہتا تھا۔

بہر حال ہم نے شب و روز کی محنت سے اس سنٹر کو پہلے سال کا میابی سے چلایا، اس کی رپورٹ بنائی اور کافی لوگوں (جن تک ہماری رسائی تھی) تک رپورٹ کی ہارڈ اور سافٹ کاپی پہنچائی۔ جس سے نہ صرف UN بلکہ عام لوگوں کا بھی ہم پر اعتماد بحال ہو گیا کہ ہم اس کو چلانا جانتے ہیں۔ اور یہ پلانٹ اپنی مدد آپ کے تحت چلایا جا سکتا ہے۔ اب ہم پر ایک اور طرح کی تنقید شروع ہو گئی کہ

یہ سوسائٹی سے ملنے والی فیس سے چل رہا ہے۔ یہ امیر علاقہ ہے۔اس لئے قابل عمل ہے یا یہ اسلام آباد ہے وغیرہ وغیرہ۔اس طرح ہمارا یہ کام فتح سندھ کا محرک بھی بنا۔جس پر ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔کہ یہ نہ صرف غریب آبادی میں چل رہا ہے۔ بلکہ بغیر فیس کے چل رہا ہے۔اگر چہ اس کی بنیاد ایک غریب کمیونٹی میں رکھی گئی ہے تاہم یہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ایک اور وسوسہ اور رکاوٹ یہ رہی کہ یہ ماڈل تو UN کا ہے۔آپ کون ہوتے ہیں اس کو بغیر اجازت دوسری جگہ چلانے والے تو ہم نے سندھ میں اس پابندی کو بھی ختم کر دیا اور بغیر باکس بنائے پائل میں ویسٹ کو پروسیس کیا۔جو نہ صرف کم خرچ بلکہ زیادہ آسان اور مؤثر ہو گیا ہے۔ البتہ جگہ کچھ زیادہ درکار ہو رہی ہے۔

کشمیر کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی والے اب اس پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ اور اپنے وزٹرز کو ہمارے پاس لاتے ہیں کہ ہم لوگوں نے یہ نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔اگر چہ اسطرح کی سوسائٹیز پنڈی اسلام آباد میں 40 کے قریب ہیں۔ لیکن یہ سہولت صرف ''جموں اینڈ کشمیر کوآپریٹو ہاوسنگ سوسائٹی'' کے پاس ہے۔ جو اپنا کچرا خود ری سائیکل کر رہی ہے۔آپ اس سوسائٹی کو زیرو ویسٹ سوسائٹی کہہ سکتے ہیں۔انہوں نے اپنا STP بھی بنالیا ہے۔جس سے یہ علاقہ مزید ماحول دوست بن گیا ہے۔

اس سنٹر کیلئے ہمارا ان کے ساتھ 10 سال کا معاہدہ ہے۔جو قابل تجدید ہے۔زندگی نے وفا کی تو جنم جنم کا ساتھ رہے گا۔اس کارواں کو آگے

بڑھائیں گے ایسا نہ ہو کہ اسلام آباد کراچی کی طرح کچرا چی کہلانے لگے۔ایک سال کی کامیابی کے بعد جرمن ایمبیسی کی نمائندہ نے یہ پلانٹ وزٹ کیا۔ہم نے ان کو پرپوزل دی کہ اس آئیڈیا کو دیگر شہروں تک پہنچانے کیلئے ہم وہاں کے لوگوں کو تربیت فراہم کرنا چاہتے ہیں۔تو انہوں نے ہمیں فنڈ کر دیا۔جس سے ہم نے 18 اضلاع کو یہ تربیت فراہم کی اور ان شہروں کے لوگوں کو یہ پلانٹ بھی دکھایا۔

اسی طرح ایگریکلچر یونیورسٹی کے VC رائے نیاز احمد نے وزٹ کیا اور ہماری اس کاوش کو پسند کیا اور ہمارے ساتھ MOU پر دستخط کئے۔ہم نے اس ماڈل کی شوکیسنگ یونیورسٹی کیمپس میں کی اب COMSAT یونیورسٹی اور NUST کے پروفیسرز بھی اس میں دلچسپی لے رہے ہیں حبیب اور NED یونیورسٹی کراچی کے پروگراموں میں بھی اس ماڈل کو پیش کرنے کا موقع ملا۔بیلجیم میں بھی یہ ماڈل پیش ہوا ہے۔

بنگال کا سفر

IRRC بنانے کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کیلئے ہمیں بنگال کی گلیوں کی خاک بھی چھاننا پڑی جہاں دو ساتھیوں نے ملکر بنگال (ڈھاکہ) میں IRRC کا ماڈل تیار کیا اور UN-ESCAP نے اس ماڈل کو اپنایا اور پورے ساؤتھ ایشیاء میں پھیلا دیا۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں دو مرتبہ بنگال کا سفر کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ اورینٹیشن (Orientation) لینے کے لئے اور دوسری مرتبہ اوپریٹنگ ٹریننگ کیلئے۔

بنگال میں IRRC کے ماڈل چھوٹے پیمانے پر بھی بنے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے ہمیں 100 ٹن والا ماڈل بھی دکھایا۔ 100 ٹن والے سنٹر میں تمام کچرا منڈی سے آتا ہے۔ تاجر تنظیموں کی مدد سے تمام کچرا ٹرکوں میں لوڈ ہوتا ہے۔ اور پھر 8 سوٹکہ فی ٹن کے حساب سے پلانٹ تک پہنچایا جاتا ہے۔ جہاں وزن کر کے کچرا بکس میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایک خاص مدت تک ٹریکٹر کی مدد سے ورکرز اُسے اُلٹ پُلٹ کرتے رہتے ہیں 45 دن بعد پیس کر پیک کر دیا جاتا ہے۔ اور بازار میں فروخت کے لئے الگ سے ایک پارٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ''ویسٹ کنسرن ڈھاکہ'' ویسٹ کے دیگر پہلوؤں پر بھی تحقیق اور تجربات کر رہی ہے۔ جس میں پلاسٹک کا استعمال، بیٹری کا ویسٹ، میڈیکل ویسٹ کا حل وغیرہ۔

''ویسٹ کنسرن ڈھاکہ'' میں کام کرنے والے دونوں ساتھی خاصے متحرک اور ماہر ہیں اور عرصہ سے اس فیلڈ میں ہیں۔ان کے بارہ میں ڈھاکہ کے ایک پروفیسر نے کہا کہ یہ علم کے دو مینار ہیں۔اور اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ انہوں نے اپنی لیبارٹری بھی بنا رکھی ہے۔ریسرچ ورک بھی کرتے ہیں مطبوعات بھی ہیں۔مختلف TV چینلز پر ٹاک شو میں کچرے کے محاصل پر بحث مباحثہ بھی کرتے ہیں۔کہ کچرا کچرا نہیں ہے۔بلکہ ایک ریسورس ہے۔اور یہی ہم نے بھی ان سے سیکھا ہے۔میں نے ان کا نام بہت پہلے سنا ہوا تھا۔اور ایک دو دفعہ رابطہ بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔البتہ ان کا کام میں نے خدا کی بستی کراچی میں دیکھا۔جہاں تسنیم صدیقی صاحب کی معاونت سے 10 سال پہلے انہوں نے ایک پلانٹ لگایا تھا۔جو بعدازاں چل نہیں پایا۔مجھے اس پلانٹ کے نہ چلنے کی دو وجوہات سمجھ میں آئی ہیں۔ایک تو خدا کی بستی کے لوگوں کی دلچسپی نہیں ہے۔دوسرا عوام سیاسی تنازعات کا شکار ہیں۔ایک وجہ یہ بھی رہی کہ یہاں سبز کچرا نہیں ہے۔کیونکہ زیادہ تر لوگ دال چاول یا مچھلی کھاتے ہیں۔بہرحال وجہ جو بھی رہی ہو۔وہاں پر یہ پلانٹ ایک دن بھی نہیں چلا۔اگرچہ گلیاں کچرے سے بھری ہوئی ہیں۔پہلی دفعہ جب ہم بنگال گئے تو جموں وکشمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری لطیف قریشی اور ایگزیکٹو سیکرٹری ظہیر خان صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔

یہ دونوں صاحبان اطمینان حاصل کرنے کیلئے گئے تھے کہ اگر ہم یہ پلانٹ اپنی سوسائٹی میں لگالیں گے تو اس سے مسائل تو پیدا نہیں ہوں گے؟ ہم نے

2 سے 3 دن اس پر بھر پور بحث کی۔ اور ایک پورا دن ڈھاکہ میں پلانٹ پر گزرا۔ وہاں دن کا کھانا کھایا۔ اور اس کے فوائد اور مضمرات کو سمجھا۔ اس میں ہونے والے کام کو دیکھا سب نے سوال و جواب کئے۔ جس کا تسلی بخش جواب ملا۔ اسطرح پہلے وزٹ میں IRRC کے عملی وجود کے بارے میں سنجیدگی سے غور وغوص کیا گیا اور ہم اسلام آباد میں IRRC بنانے کا ارادہ کر کے واپس آئے۔

پاکستان واپس آ کر سوسائٹی والوں نے تسلسل سے میٹنگ کیں اور e-guard کو IRRC کی موجودہ جگہ دینے کی منظوری دی گئی۔ جو STP کے قریب ہے اور یہ تقریباً 1.5 کنال جگہ ہے۔

اسی کے بعد اس جگہ کا سائز اور طرفین کی شرائط کی تفصیلات UN کو ارسال کی گئیں جنہوں نے اس پر کام شروع کیا مٹی کو ٹسٹ کیا گیا۔ ہوا کے رُخ کا اندازہ ہوا۔ آنے والے سیلاب اور زلزلہ کی مقدار کو جانچا گیا۔ گوگل پر مارکینگ ہوئی۔ غرض وہ تمام ابتدائی اقدامات جو کسی بڑی بلڈنگ کو بنانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں لئے گئے۔ تا کہ مستقبل میں کسی خدشے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کا نہ صرف نقشہ تیار کیا گیا بلکہ BOQ بھی بنایا۔ تا کہ تخمینہ کا اندازہ بھی رہے۔

اس پر ٹوٹل 95 لاکھ روپے خرچ آیا۔ جس میں ایک دفتر، ایک سٹور، ایک چوکیدار کا کمرہ دو الگ الگ باتھ روم اور ایک واش روم بنایا گیا۔ جبکہ کچرا ڈالنے کے لئے 12 بکس اور 3 میچورنگ بکس بنائے گئے۔ ان تمام کو دھوپ اور بارش سے بچانے کیلئے اوپر لوہے کی چھت بھی ڈالی گئی۔ اس طرح بارش کے پانی

اور لیچٹ کے لئے الگ الگ ٹینک بنائے گئے۔ بائیوگیس کے لئے پلانٹ بھی تیار کیا گیا۔

غرض تمام تجربات جو مختلف ممالک میں IRRC چلاتے ہوئے حاصل کئے گئے۔ ان سب کو اسلام آباد میں استعمال کیا گیا۔ اس تمام عمل کو نہ صرف UN بلکہ ڈاکٹر اختر حمید خان میموریل ٹرسٹ کے لوگ بھی دیکھتے رہے اور اپنے ریمارکس دیتے رہے۔ اگرچہ بنگال سے براہ راست کوئی دیکھنے نہیں آیا لیکن ان کا نیپالی نمائندہ ''بوشان'' اس کو دیکھتا رہا۔ پھر ''لورینز وجواوا'' بھی آتے رہے اور اس کے معیار کو جانچتے رہے ،اسطرح کئی ماہرین کی نگرانی میں G-15/4 اسلام آباد میں IRRC وجود میں آیا۔

پلان میں بھی تھا کہ گھروں سے کچرا الگ الگ ہو کر آئے گا۔ اور اس کے لئے کافی کوشش بھی کی گئی لیکن ابھی تک ایسا ہو نہیں سکا۔ ہم نے شروع میں دو رنگ کی تھلیاں بھی لوگوں کو دیں۔ اور مختلف یونیورسٹیز کی مدد سے گھر گھر جا کر لوگوں کو سمجھایا بھی لیکن ناکام رہے۔ اب ہم نے دو رنگ کی ٹوکریاں دی ہیں اور باہر ڈبے بھی لگائے ہیں۔ لیکن وہ بھی ابھی تک زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

IRRC کو چلانے کے مکمل عمل کو سیکھنے کیلئے ہم دوسری مرتبہ بنگال گئے۔ اس مرتبہ بلاول خان بھی میرے ساتھ تھا۔ وہاں پر چار ملکوں کے لوگ اکھٹے تھے ہم نے اس سنٹر کے پورے عمل کو سیکھا۔ کہ بکس میں کچرا کیسے ڈالتے ہیں۔ ٹمپریچر کس طرح ناپیں گے اور اس کا ریکارڈ کیسے رکھتے ہیں اور پیکنگ کیسے

کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اس تمام عمل کو پورے ہفتے میں سیکھنا تھا کہ جب پاکستان میں IRRC مکمل ہوتو چلانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

ایک اورعنوان جس پر سعدیہ اور سمیرا گزشتہ ایک برس سے کام کر رہی تھیں ''بزنس پلان'' تھا کہ اس پر پانچ سال تک اخراجات کیا ہوں گے اور آمدن کیا رہے گی۔اس پر بھی ڈھاکہ میں بڑی تفصیلی بات ہوئی۔بقول عارف حسن کہ جہاں بھی کام شروع ہوتا ہے وہاں پہلے رعائت دی جاتی ہے۔بعد میں مکمل قیمت وصول کر کے کچرا اکھٹا کیا جاتا ہے۔جس کے نتیجے میں پروگرام بند ہو جاتا ہے۔تم لوگ پہلے دن سے ٹھیک قیمت لے رہے ہو۔اس لئے تم لوگوں کا پروگرام بند نہیں ہوگا۔

بالکل ایسا ہی ہوا کہ ہم نے گھروں سے فیس، کباڑ سے آمدن، کھاد سے آمدن کے ٹھیک تخمینے لگائے،اور ان تخمینوں کا ذکر بنگال کے ساتھیوں سے کیا۔ اُنہوں نے اس کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ آپ کا پروگرام کبھی بند نہیں ہوگا۔کیونکہ آپ لوگ اسے پہلے سے اپنی مدد آپ کے تحت چلا رہے ہو۔کسی ڈونر یا گورنمنٹ کے کسی ادارے سے کوئی مدد نہیں لے رہے۔

ہم نے ایک ایک چیز کا تخمینہ لگایا۔کہ کتنے گھروں کے لئے کتنے ورکرز درکار ہوں گے،اور کتنی گاڑیاں وغیرہ۔ہم نے 400 گھروں کیلئے دو ورکر ایک ڈرائیور اور ایک سوزوکی پک اپ ڈیزائن کی۔اسی طرح کباڑ سے آمدن کا تخمینہ بھی لگایا اور کھاد کا بھی اس کے پیک کرنے اور مارکیٹ تک پہنچانے تک کے تمام

اخراجات کا آئندہ پانچ سال کا تخمینہ بنالیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ موجودہ مکانات کتنے ہیں اور ہر سال کتنے نئے گھر تعمیر ہوں گے اور ہماری فیس میں سالانہ کتنا اضافہ ہوگا۔فیس میں مہنگائی کے لحاظ سے سالانہ بڑھوتری کا تخمینہ بھی بنایا گیا البتہ ان میں سے کچھ اندازے غلط بھی ثابت ہوئے لیکن مجموعاً ہم خسارے میں نہیں رہے۔IRRC کو منافع بخش سینٹر کی طرز پر ڈیزائن کر کے چلانے کا تخمینہ لگانے، بچت اور چلانے کا طریقہ کار سب کچھ ہم نے بنگال سے سیکھا۔جس کیلئے دو مرتبہ بنگال کا سفر کیا۔اس کے علاوہ UN-Habitat اور UN-ESCAP کے تمام ساتھیوں کے ساتھ ملکر ہماری ٹیم نے بھرپور کام کیا۔جس کے نتیجے میں یہ شاہکار تخلیق ہوا۔جس میں مقامی کمیونٹی اور سوسائٹی کے لوگوں کا تعاون اور حصہ بھی نہائت اہم ہے لیکن سب سے بڑھ کر ہمارے ورکروں نے شب و روز محنت سے اس کے چہرے کو نہ صرف قابل رشک بنا رکھا ہے بلکہ ایک منافع بخش ادارے کے طور پر چلا رہے ہیں۔اوران کی محنت سے Trash is Cash کا نعرہ اب نعرہ نہیں رہا بلکہ زندہ حقیقت بن چکا ہے۔

بلوچ سردار سے ملاقات

عدنان علیانی (Adnan Aliani) لسبیلہ کا نواب ہے۔لیکن ایک مدت سے بنکاک میں UN-ESCAP میں کام کر رہا ہے۔گزشتہ برسوں سے ایک تسلسل کے ساتھ ہر سال پاکستان آتا ہے۔اور اس کوشش میں رہا کہ IRRC کا ساوتھ ایشین ماڈل پاکستان میں بھی شروع ہو جائے۔محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد وفاق اور سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔جبکہ پنجاب میں شہباز شریف وزیراعلیٰ تھے۔وہ پیپلز پارٹی کے پاس گیا تو انہوں نے نواب شاہ بھجوا دیا۔جبکہ وزیراعلیٰ پنجاب اس ماڈل کو مظفر گڑھ میں بنانا چاہتے تھے۔دونوں جگہ ناکامی کے بعد عدنان صاحب پنجاب میں اربن یونٹ کے پاس گئے۔انہوں نے بتایا کہ خادم اعلیٰ کی دلچسپی مری میں ہے۔

اگلی مرتبہ جب عدنان صاحب آئے تو اربن یونٹ کے ہمراہ مری چلے گئے،اس وزٹ میں ہم بھی ساتھ تھے۔وہاں کے TMA سٹاف اور AC صاحب نے ہمیں ٹھنڈا جنگل وزٹ کرایا۔جہاں پر پوری مری کا کچرا پھینکا جاتا تھا اور پھر آگ لگا کر جنگل کو گرم کیا جاتا ہے یا جلایا جاتا ہے۔بہرحال وہاں سے بھی مایوس لوٹے تو شاید دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ میں کبھی پاکستان نہیں لوٹوں گا۔میں نے ان کی پریشانی بھانپ لی۔لیکن ان کے اردگرد والے لوگ ان کو چھوڑ نہیں رہے تھے۔میں کوشش کر کے انہیں اسلام آباد ہائی وے کے کنارے

کی ایک آبادی شکریال لے گیا۔اوراس کے بعد میں نے ایک چھوٹا سا ہریالی سنٹر ڈھوک سیداں میں بنایا تھا وہ وزٹ کرایا۔وہ بہت خوش ہوئے اور تمام ورکروں سے بات چیت کی۔انہوں نے کہا کہ میں اگلی بار جب آؤں گا تو آپ لوگوں سے ملوں گا۔ہم نے ان کو روٹین کا وزیٹر سمجھا اور بھول گئے۔

اگلے سال جب وہ آئے تو ''لورنیزو'' کو بھی ہمراہ لائے اور میٹنگ ہوئی۔اس ملاقات کی کسی ایک نشست میں عارف حسن بھی موجود تھے۔انہوں نے عارف حسن صاحب کو بھی بتایا کہ ہم اسطرح کا ایک IRRC بنانا چاہتے ہیں۔لیکن میں ہر سال آتا ہوں اور مایوس لوٹ جاتا ہوں۔بات اوپر سے شروع کرتے ہیں نیچے آکر ختم ہو جاتی ہے اس پر عملدرآمد نہیں ہو پاتا مجھے یاد آیا کہ انکو KPK گورنمنٹ نے شاید مردان بھی بھیجا تھا لیکن بے سود۔

ہم اس وزٹ میں انہیں ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کے پاس لے گئے۔DC صاحب نے اخبار کیلئے فوٹو بنوائی اور اگلے دن ایک بڑی خبر بھی انگریزی اخبار میں چھپی۔لیکن IRRC کیلئے جگہ دینے سے انہوں نے بھی انکار کر دیا۔کوئی اس آئیڈیا کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھا۔کہ ایسا ہوسکتا ہے۔اور آبادی کے اندر کوئی پلانٹ لگ سکتا ہے۔عدنان صاحب ایک مرتبہ پھر مایوس ہوئے۔میں ایک بار پھر موقع غنیمت جان کر ان کو خیابانِ کشمیر لے گیا جہاں انہیں اپنا کام دکھایا۔وہ ایک بار پھر پُر اُمید ہوئے اور اگلے سال دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔

اگلے سال وہ نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ ''لورنیزو'' اور'' جواوا'' آئے۔

UNنے ان سے ملاقات کروائی اور خیابانِ کشمیر وزٹ کیا۔ وہ کچھ بتاتے نہیں تھے شاید آپس میں مشورے کے بعد یہاں کیلئے ہاں یا نہ میں جواب دینا چاہتے ہوں۔

بہرحال انہوں نے خیابانِ کشمیر اور مردان کو ویسٹ سٹڈی کیلئے منتخب کیا۔ I-9 کی سٹڈی بھی شاید اس دوران طے ہوئی ہم تذبذب میں تھے۔ کہ نہ معلوم کس جگہ کا انتخاب ہو اور کہاں پر یہ پلانٹ لگے۔ بہرحال ہم نے اس دوران خیابانِ کشمیر کی انتظامیہ کو جگہ دینے کے لئے تیار کیا۔

ویسٹ سٹڈی کا آغاز ہو گیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جس سفارشی کو ویسٹ سٹڈی کا کام دیا گیا۔ وہ زمین پر گیا ہی نہیں۔ وہ ٹیبل سروے کر رہا تھا۔ اس نے مردان کے بارے میں یہ رپورٹ دی کہ یہاں گرین ویسٹ نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہاں پشتون ہیں اور پشتون گوشت خور ہیں لہٰذا سبز کوڑے کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہے اگر چہ سبزی اگانے کے ماہر اور بہترین کسان مردان ڈویژن میں موجود ہیں۔ ہماری خوش نصیبی تھی۔ کہ اس رپورٹ کے تناظر میں یہ طے پایا کہ IRRC، G-15 خیابانِ کشمیر اسلام آباد میں ہی بنایا جائے گا۔ یہاں پر ماحول سازگار ہے۔ اور اس پر سنجیدگی سے کام شروع کیا جائے۔ مجھے مردان میں نہ ہونے کا دکھ بھی ہوا کیونکہ مردان میرا آبائی علاقہ ہے۔

بہرحال سوسائٹی انتظامیہ پہلے ہی ہمیں جگہ دینے کے لئے آمادہ تھی۔ جہاں قریبی لوگوں نے اعتراض کیا۔ پھر موجودہ جگہ الاٹ کی۔ UN-ESCAP کے ساتھی دو سال تک آتے رہے۔ اور میٹنگ کر کے چلے

جاتے رہے۔ مجھے بہت غصہ آتا۔ایک میٹنگ میں میں نے ان کو کھری کھری سنا دیں ۔ بھائی صاحب آپ لوگ ہر دفعہ آتے ہو اور بغیر عملی کام کئے چلے جاتے ہو۔ہمیں سوسائٹی والوں نے بھی پابند کیا تھا کہ اگر سال کے اندر اندر کام شروع نہیں کیا تو ہم لینڈ الاٹمنٹ کینسل کر دیں گے مجھے ڈر تھا کہ ساری محنت ضائع نہ ہو جائے۔ بنیادی نقشے ، بلڈنگ نقشے ،سائل ٹیسٹنگ مکمل ہو گئے لیکن کام پھر بھی شروع نہیں ہوا۔ کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے NOC نہیں ملا ۔جسکے لئے ماحولیاتی اثرات کی سٹڈی درکار تھی ۔ وہ ایک اور سفارشی کے قبضے میں تھی ۔جسکو UN نے کہا تھا۔ہم نے دن رات فالواپ کر کے وہ جمع کروائی ۔اب EPA نہ مانے انہوں نے کہا کہ CDA کی رضامندی تک ہم NOC نہیں دیں گے۔CDA کے افسران سے سمیرا کی دعا سلام اچھی تھی ۔اس نے مسلسل جدوجہد سے CDA کی طرف سے اجازت نامہ دلوادیا۔اب EPA میں کیس پھنس گیا۔UN،JKCHS اور سمیرا کی کوششوں سے ہم نے EPA سے NOC لے لیا۔خدا خدا کر کے ٹینڈر کیا گیا۔اس عمل میں UN نے ہمیں باہر رکھا خود ہی لوگوں کو شارٹ لسٹ کیا اور خود ہی تعمیراتی کمیٹی کا انتخاب کیا۔ہمیں خوشی ہوئی کہ اب کام شروع ہو جائیگا۔لیکن ہماری خوشی اُس وقت خاک میں مل گئی ۔جب ہم نے دیکھا کہ تعمیراتی کمپنی اس پراجیکٹ سے جیبیں بھرنا چاہتی ہے۔انہوں نے پہلے کہا کہ اس پلاٹ سے میں یہ مٹی ہٹائی جائے جو قریبی STP کی تھی ۔سوسائٹی والوں نے کہا آپ ہٹا دیں ۔ہم معاوضہ دے دیں

گے۔تو مٹی ہٹائی گئی۔بعد میں UN کو کہا کہ یہ جگہ نیچے ہے یہاں مٹی کی بھرائی کی جائے۔جس کے UN سے اضافی پیسے چارج کئے پھر شروع میں 50، 60سال کا ایک بابا تیشی کرنڈی کے ساتھ لگا دیا۔جو آہستہ آہستہ دن میں تھوڑا سا کام کرتا۔ہم نے شور مچایا تو انہوں نے ہمارے داخلے پر پابندی لگا دی۔ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔اور مزید مداخلت نہ کرنے کا تہیہ کرلیا کہ کہیں کام بند نہ ہو جائے۔ جیسے تیسے کر کے انہوں نے کام مکمل کرلیا۔اس طرح کئی برسوں کی جدوجہد کے بعد ایک ایسی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔شاید بلوچ سردار کی کوشش اور کاوش بھی رنگ لے آئی۔

یہ سینٹر پاکستان کے دارالخلافہ میں بنایا گیا۔جسکو اکنامک سروے میں بھی شامل کیا گیا۔اس کے تعمیراتی جائزے میں ایگریکلچر یونیورسٹی بھی شامل رہی۔وزارت ماحولیات نے بھی مانیٹر کیا البتہ عدنان پھر پاکستان نہیں آیا لیکن اس کی رکھی ہوئی بنیادوں پر اب عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔

اس دوران دو واقعات مزید پیش آئے ان کا ذکر بھی ضروری ہے تا کہ اس ماڈل کو اپنانے والے آگاہ ہوسکیں کہ کیا کیا رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں۔اور ان کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ایک دن ہمیں اچانک فون کال موصول ہوئی کہ ایک آدمی کچھ بندے لیکر آیا ہے اور اس نے کام بند کروادیا ہے۔ہم بھی مع اپنے اہل وعیال کے موقع پر پہنچ گئے۔معلوم ہوا کہ نالے کے اُس پار ایک شخص کی زمین ہے اور اس کا کلیم ہے کہ یہ نالہ بھی اس کی ملکیت ہے۔اور نالے کے ساتھ ساتھ

ہماری طرف 1.5 فٹ جگہ بھی اس کی ہے۔لہذا اس کنارے پر کام نہ کیا جائے۔ہم نے سوسائٹی والوں کو بتایا۔انہوں کہا گارڈ لے جائیں۔آپس میں صلاح مشورہ کیا اس شخص کی بات کو سمجھا اور پھر اسکو سمجھایا کہ یہ سنٹر نہیں بنے گا تو یہ سارا نالہ گند سے بھر جائے گا اور تمہارا رہنا مشکل ہو جائیگا اس لئے کام میں مداخلت نہ کر ہم تمہاری ڈیڑھ فٹ زمین کو نہیں چھیڑیں گے۔اس طرح اس کی منت سماجت کر کے بات ختم کر دی۔

یہ تو ایک روائتی دیہاتی تھا۔اس کے بعد ایک شہری ٹکر گیا۔جس کا پلاٹ سامنے والی گلی میں تھا۔اس کو خدشہ تھا کہ اگر یہ سنٹر بن گیا تو ہمارا یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔چنانچہ اس نے CDA کے چیئر مین اور EPA کو خط لکھ دیا جس پر ہمیں اور سوسائٹی کو نوٹس جاری ہو گیا۔اس شخص کو بھی بلا کر بڑی مشکل سے مطمئن کیا کہ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوگا کہ جس سے یہاں کے مکینوں کا نقصان ہو اگر ایسا کچھ ہوا تو ہم اس کو بند کر دیں گے۔تمام افراد کی یقین دہانی پر وہ بھی بمشکل راضی ہو ہی گیا۔اس طرح مندرجہ بالا مشکلات اور مصائب برداشت کرنے کے بعد G-15 اسلام آباد میں IRRC کی تعمیر اور کام کرنے کی سبیل پیدا ہوئی جس پر آج جموں کشمیر کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی والے ناز کرتے ہیں۔ اور AHKMT اس ماڈل کو ملک بھر میں ریپلیکیٹ کرنے کی خواہش لے کر سندھ تک صحرا نوردی کرتی نظر آتی ہے۔

فضل عالم

UN-HABITAT سے رابطے کا ذریعہ فضل نور تھا۔ فضل نور سے میری واقفیت 20 سال پرانی تھی۔ کراچی میں وحید نے ایک مرتبہ ان سے ملوایا تھا۔ فضل نور ''اشو کا فیلو'' بناتا تھا۔ ہم بھی فیلو تو بنے لیکن معیار پر پورے نہیں اترے۔ فضل نور صاحب جب UN میں تھے تو ان کا کنٹری ڈائریکٹر ایک ایرانی نژاد ''سیامک'' جو کہ بہت متحرک تھا۔

فضل نور فیاض باقر کے ساتھ ایک پراجیکٹ کرنا چاہتا تھا۔ جس کے لئے انہوں نے مجھے منتخب کیا۔ ہم نے پاکستان میں چھ جگہ پر کچھ سرگرمی کرنا تھی۔ میں نے پراجیکٹ فائنل کیا اور مختلف جگہ سرگرمیاں ڈیزائن کیں اسی دوران فضل نور نے مجھے بتایا۔

''کہ وہ ویسٹ (Waste) کے لئے ایک منصوبہ سوچ رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا ایک ''فیئر پرائس شاپ'' بنائی جائے جہاں پر لوگ ویسٹ سیل کریں۔ یا ورکر گھروں سے ویسٹ اکھٹا کر کے لائیں اور سیل کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ راولپنڈی میں یہ کام سمیرا کر رہی ہے۔ اس نے واٹر ایڈ کی مدد سے 2000 گھروں کا ماڈل بنایا ہے۔ جہاں پر ایک فیئر پرائس شاپ بھی ہے جس کو ''ہریالی سینٹر'' کہتے ہیں جہاں پر کباڑ والا ان سے کباڑ خریدتا ہے۔ جبکہ گرین ویسٹ سے چھوٹی سطح پر کھاد بھی تیار کی جاتی ہے۔ فضل نور نے سمیرا کے پاس

شازیہ اور توقیر عباسی کو بھیجا۔ انہوں نے یہ سنٹروزٹ کیا۔ بریفنگ لی اور رپورٹ کی فضل نور نے کہا کہ اس ماڈل کو پاکستان کے چھ شہروں میں کرتے ہیں جس کیلئے مینگورہ، مانسہرہ، مظفر آباد، سیالکوٹ، گلگت اور اسلام آباد کا انتخاب ہوا۔ طریقہ کار یہ طے پایا کہ DC کے زیر نگرانی پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی (Steering Committee) بنائی جائے جس میں متعلقہ اداروں اور شہریوں کو نمائندگی دی جائے یہ کمیٹی پراجیکٹ کی نگرانی بھی کرے ہر شہر کی کمیٹی نوٹی فائی ہوگی۔ کام شروع کرنے سے پہلے ایک فورم کیا گیا جس میں شہریوں کو اکھٹا کر کے طریقہ کار سمجھایا گیا اور کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا، مقامی تنظیم اور کمیٹی کی میٹنگ کا شیڈول طے کیا گیا، طے پایا کہ کمیٹی کی ماہانہ میٹنگ ہوگی، DC کا نمائندہ AC اس کو چیئر کرے گا۔ میٹنگ میں کام کی پراگرس کا اندازہ کیا جائے گا اور آئندہ کی حکمتِ عملی بھی ترتیب دی جایا کرے گی۔ اسلام آباد میں تمام شہروں کے نمائندوں کو 3 روزہ تربیت دی گئی۔ اورای گارڈ پراجیکٹ ڈھوک سیداں دکھایا گیا۔ اس عمل کے دوران UN سمیت تمام شہروں کے ساتھ ہمارا ایک نیٹ ورک بن گیا۔ سمیرا اور سعدیہ تمام شہروں میں جاتی تھیں۔ اور کچرے کے انتظام (Solid Waste Mnagement) پر بات کرتی تھیں۔

UN کا نمائندہ اکثر میٹنگ میں بھی شامل ہوتا تھا۔ خانزادہ، شازیہ اور میرا دکھ بھی مشترک ہے، میری طرح وہ دونوں بھی متاثرین ہزارہ ہیں۔ خانزادہ کی بیوی اور شازیہ کا شوہر ہزارہ سے ہیں اور سمیرا بھی۔ جب کہ ہم تینوں کا آبائی

تعلق مردان سے ہے اس لئے جب اکھٹے ہوتے تو فضل نور صاحب کو بتاتے کہ ہم متاثرین ہزارہ اکھٹے ہو گئے ہیں۔ جب سمیرا مجھے گھورتی تو میں دلیل دیتا کہ متاثر سے مراد ''Impress'' ہے ''Effective'' نہیں۔ بہر حال اس طرح خوب ہنسی مذاق رہتا۔

اسلام آباد میں ایک نیا کلچر متعارف ہوا سیکورٹی کی وجہ سے سرینا ہوٹل والوں نے ایک بزنس کمپلیکس بنایا۔ جس میں UN اور تمام انٹرنیشنل اداروں کے دفاتر تھے۔ جسکی سیکورٹی سخت تھی۔ ان تمام اداروں کیلئے سب سڈائزریٹ پر ایک کیفے ٹیریا کا بھی انتظام کیا گیا۔ جس میں بوفے لنچ ہوتا تھا۔ ہم اکثر فضل نور اور شازیہ کے مہمان ہوتے۔ اور وہاں بوفے انجوائے کرتے جو ہالف بھی ہوتا اور فل بھی۔

ایک مرتبہ سعدیہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ فضل نور ہمیں لنچ پر لے گئے۔ سب نے لنچ لیا۔ سعدیہ نے حسب معمول پلیٹ کے ایک کونے میں ایک چمچ سالن اور چوتھا حصہ نان کا لیا۔ سرینا انتظامیہ کی ایک خاتون نے آ کر سوال کیا کتنے فل بوفے ہیں؟ فضل نور نے سعدیہ کی طرف اشارہ کر کے انتہائی معصومیت سے کہا یہ آپکو فل بوفے لگ رہا ہے کیا؟ اس جملے کو ہم سب نے فل انجوائے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کھانے کے حوالے سے سعدیہ کا حساب شازیہ برابر کر دیتی تھی۔

جب ہم پروگرام پر عملدرآمد کرانے مظفرآباد گئے تو دو تنظیموں میں

تنازعہ ہوگیا۔ایک تنظیم کہتی کہ ہم کام کریں گے۔دوسری تنظیم کہتی کہ ہم کام کریں گے۔اس دوران میڈیا والے آگئے اور فضل نور سے سوال جواب شروع کر دیئے کہ یہ جھگڑا کیا ہے؟فضل نور نے کہا جھگڑے کا تو مجھے معلوم نہیں بھائی، دو تنظیموں مین تنازعہ ہے۔

ایک کہتا ہے ''میں کوڑا اُٹھاؤں گا''

دوسرا کہتا ہے ''کوڑا میں اُٹھاؤں گا''

مجھے لگتا ہے ''اگلی عالمی جنگ کوڑے پر ہوگی''

سیالکوٹ میں شکور مرزا کا اپنا طریقۂ کار تھا جو وہ کچرے کے متعلق بھی اپنانا چاہ رہے تھے جب کہ فضل نور کا زور تھا کہ ای گارڈ جیسے چل رہا ہے ویسا ہی کرو۔

گلگت میں DCO صاحب امن کوڑے کے ذریعے لانا چاہ رہے تھے۔وہ شیعہ اور سنی کا جھگڑا اس کوڑے کے ذریعے ختم کرنا چاہتے تھے۔لیکن وہ بھی دھن کے پکے تھے۔ہمارا ڈیزائن یہ تھا کہ ہر 100 گھروں پر ایک ورکر لگتا ہے۔لیکن انہوں نے ایک جگہ 70 گھروں پر ایک ورکر لگایا تھا۔دوسری جگہ 130 گھروں پر ایک ہم نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ شیعوں کے گھر 130 ہیں اور سنی کے گھر 70 اس لئے ہم نے شیعوں کے لئے شیعہ ورکر لگایا اور سُنیوں کے لئے سُنی یعنی ایک فرقے والے دوسرے فرقے کا کوڑا بھی نہیں اُٹھا سکتے۔ورنہ فساد ہو جاتا ہے۔

البتہ مظفر آباد، مانسہرہ، مینگورہ میں پروگرام بہت اچھا چلا۔گلگت اور

سیالکوٹ میں فیل ہوگیا۔ جہاں پروگرام اچھا چلا وہاں پر TMA والے ہم سے بہت تنگ ہوئے۔ کیونکہ پہلے گند گلیوں نالیوں میں اور خالی پلاٹوں میں پڑا رہتا تھا۔لیکن اب ہم نے ای گارڈ کی مدد سے ایک جگہ اکھٹا کر دیا۔ جو TMA والوں کو اُٹھانا پڑ گیا۔ وہ کہتے تھے کہ پہلے ہم ایک ٹرالی اُٹھاتے تھے اب چھ ٹرالی کوڑا اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح ہمارا پراجیکٹ ڈسٹرب ہوگیا۔شہریوں کیلئے بھی یہ نیا طریقہ کار تھا کہ انہیں 100 روپے گھر کا کچرا اُٹھانے کیلئے دینا پڑ گئے۔

اس پروگرام کے شروع میں سینیٹری ورکر بھی تنگ کرتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ نہیں ملتے جو پروگرام کو دل جمی سے کرتے ہوں۔ ان مشکلات پر قابو پانے کیلئے ہم اپنے تجربات سے ان کو آگاہ کرتے ہیں۔ اس کام کے دوران مجھے اور فیاض باقر صاحب کو چترال کی ویسٹ سٹڈی کا کام بھی مل گیا۔ ہم نے اپنے تمام تجربات اس سٹڈی میں استعمال کئے۔ ہم نے 220 گھروں سے پوچھا کہ آپ ویسٹ کا کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ دریا میں ڈالتے ہیں۔ دوکانداروں سے پوچھا انہوں نے بھی کہا کہ دریا میں جاتا ہے۔ ہوٹل والوں نے بھی یہی جواب دیا۔ حتٰی کہ پولیس لائن گئے ان سے ویسٹ کے متعلق پوچھا تو جواب ملا دریا میں پھینکتے ہیں۔ ہسپتال گئے انہوں نے بھی بتایا کہ ویسٹ دریا میں پھینکتے ہیں۔ جب ہم DC صاحب کے پاس گئے۔ کہ یہ گھروں والے، دوکانوں والے، ہسپتال والے، پولیس والے، سب مل کر دریا میں گند ڈالتے ہیں۔ تو

انہوں نے مجسٹریٹ صاحب سے پوچھا کہ اس گند کے ساتھ کیا کریں؟ مجسٹریٹ صاحب نے کہا دفعہ 144 لگا دیتے ہیں۔

ہم نے راولپنڈی میں TMA اور کنٹونمنٹ کو سمجھانے کی بھی کوشش کی اور ان کے ساتھ بھی ملاقاتیں کیں کہ وہ اپنے کچرے کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کریں۔لیکن وہ ہمارے ماڈل کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔اور اس کو قابل عمل نہیں سمجھتے تھے۔اگرچہ ہم نے ایک بڑی سطح پر اس پروگرام کو چلایا تھا۔

TMA سے ہمارا چھٹکارہ فضل نور نے IRRC کی بدولت ممکن بنایا۔ IRRC پر اس کے بعد بہت کم کچرا بچ جاتا ہے۔جسکو تلف کرنا پڑتا ہے۔ فضل نور،عدنان علیانی کو ڈھونڈ کر لائے اور ہم سے ملوایا جس کی بدولت ہم فاضل کچرے کو ٹھکانے لگانے کی فضیلت حاصل کر پائے۔اس لئے ہم ان کو فضلِ عالم کہتے ہیں۔

فکرمعاش

2009-10ء ہمارے لئے بہت مشکل سال تھا مگر 2000ء ہم نے اس سے بھی زیادہ مشکل میں گزرا۔ لیکن اس مرتبہ ایک ایک کر کے تمام ذرائع آمدن بند ہو گئے۔ واٹر ایڈ جو گزشتہ 15 برس سے فنڈ کر رہا تھا اس نے ہمیں خدا حافظ کہہ دیا۔ عارف حسن صاحب نے بورڈ سے استعفٰی دے دیا۔ یہاں تک کہ مجھے مہناز نے نوکری سے بھی نکال دیا۔ جبکہ OPP والے ہمیں پہلے سے ہی لفٹ نہیں کروا رہے تھے۔ اب کریں تو کیا کریں؟ بقول شاعر

؎ کروں گا کیا جو محبت میں ہوگیا نا کام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا!

ہم نے ساری زندگی یہی سیکھا تھا جو ختم ہو گیا۔ اب روزی روٹی بھی مسئلہ بن گیا۔ ہم نے واٹر ایڈ کے سہیل صاحب سے درخواست کی کہ وہ ہمیں ایک دو سال کیلئے فنڈ کریں ہم پروگرام میں تبدیلی لاتے ہیں اور بہت جلد اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو جائیں گے۔ سہیل صاحب ان دنوں انڈین سالڈ ویسٹ مینجمنٹ کا ماڈل دیکھ کر آئے تھے۔ جب ہم نے سالڈ ویسٹ کا ماڈل پیش کیا تو انہوں نے فوری منظور کر لیا۔ اسطرح 2009 میں ای گارڈ کے نام سے ہم نے سالڈ ویسٹ کا پروگرام شروع کیا۔ جسکے لئے واٹر ایڈ نے ہمیں فنڈ کیا۔

میں، اختر شاہ اور عابد مل کر ہر شام کو اس ماڈل پر بات کرتے اور سمیرا

اس پر عملدرآمد کرتی۔ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام ای گارڈ رکھا۔پھر ای گارڈ کو پرائیویٹ فرم کے طور پر رجسٹرڈ کروایا۔جو واٹر ایڈ کے وقاص صاحب کو تو اچھا نہیں لگا۔اس پروگرام کیلئے ڈھوک سیداں کا علاقہ منتخب کیا۔جہاں پر ہم کافی ساری گلیوں میں سیوریج لائن بچھا چکے تھے۔پھر یہ کنٹونمنٹ اور پوٹھوہار ٹاون دونوں پر مشتمل تھا۔کہ اگر کوئی ایک ایڈمنسٹریشن مسئلہ کرے تو دوسری میں کام کیا جاسکتا تھا۔ہم نے پانچ سو گھروں کا انتخاب کیا۔اپنی ٹیم تشکیل دی۔جس میں قیصر عباس، بلاول خان، بخشاد، زرینہ، سعدیہ کرمانی اور سمیرا گل شامل تھے۔بعد میں ذوالفقار علی اور تنویر مسیح بھی اس کا حصہ بنے ایک چنگ چی خریدا کچھ ریڑھیاں بنائیں۔یونس مسیح اور اس کی بیوی اور بچے کی مدد سے پانچ سو گھروں میں کام شروع کر دیا۔پہلے مہینے پانچ سو میں سے 220 گھروں نے 100روپے فی گھر کے حساب سے 22ہزار روپے دیئے۔ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔کہ اتنی جلدی یک دم اتنی بڑی کامیابی ہوگئی۔اس تمام عمل میں چک جلال دین کے ناظم آصف صاحب چوہدری ظفر اور راجہ الطاف نے بہت جدوجہد کی اس سارے پروگرام میں ان کی اشیر باد ہمیں حاصل رہی۔اس طرح رفتہ رفتہ اس پروگرام کو کرتے کرتے 2ہزار گھروں تک لے گئے۔اور ہمیں 2لاکھ روپے ماہانہ ریکوری شروع ہوگئی۔19ورکروں نے اس پر کام شروع کر دیا۔اس طرح سٹاف بھی، پیسے بھی اور کام بھی جب مہیا ہوگئے تو غربت کا خاتمہ ہوگیا۔لیکن اب ایک اور مسئلہ بن گیا کہ کچرا بہت زیادہ جمع ہونے

لگا۔ پوٹھوہار ٹاؤن کا تو کوئی سیٹ اپ نہیں تھا۔ کنٹونمنٹ بورڈ والے ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ کہ آپ لوگ اتنا کچرا نکال رہے ہیں۔ ہمارا بجٹ ڈسٹرب کر دیا آپ لوگوں نے۔ پہلے جہاں ہم ایک ڈمپر لے جاتے تھے اب ہمیں وہاں 6 ڈمپر لے جانے پڑتے ہیں۔ اس کام کو بند کرو۔ وہ ہماری ریڑھیاں بھی اٹھا کر لے گئے۔ ہم پھر پریشان ہو گئے اور ہماری خوشی غم میں تبدیل ہو گئی۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد ہم نے اس کا ایک حل نکالا۔ کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں پر اس ویسٹ کو کم کیا جا سکے۔ ہم نے ایک مقامی زمیندار حاجی ظفر سے 10 کنال جگہ سالانہ ایک لاکھ روپے کرائے پر لی اور وہاں اپنا ایک کمرہ مع باتھ روم کے بنالیا۔ جہاں ہم ویسٹ کو الگ الگ کرنے لگے۔ سبز کچرے سے ہم نے کھاد بنانا شروع کر دی۔ کباڑ فروخت کر دیتے۔ باقی بہت کم مقدار بچتی۔ جو ہم کنٹونمنٹ کے پوائنٹ پر پھینک دیتے۔ اس طرح کام پھر چل نکلا۔ حاجی ظفر نے دیکھا کہ ہمارا کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ تو اس نے سال پورا ہوتے ہی نوٹس دے دیا کہ جگہ خالی کریں۔ جبکہ ہمارا معاہدہ 3 سال کا تھا اس لئے ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم عدالت چلے جاتے۔ لیکن چونکہ وہ طاقتور آدمی تھا۔ اور پورے پروگرام کے بند ہونے کا خطرہ تھا اس لئے ہم نے چپ کر کے اس کی جگہ خالی کر دی اور ڈمپنگ پوائنٹ کے قریب ایک کنال کی ایک اور جگہ کرائے پر لے لی۔ تمام سامان اس میں منتقل کیا۔ اور اپنے کام کو جاری رکھا۔ بغیر کسی رکاوٹ کے۔ ہم نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور اس ایک

کنال جگہ پر ایک کباڑ والا بھی بٹھا دیا۔ جو ہمارے ورکروں سے بھی کباڑ خریدتا تھا اور باہر سے بھی خریدنے لگا اس طرح وہ 32 ہزار روپے کا ماہانہ کباڑ خریدتا اور 50 ہزار میں فروخت کر دیتا جس سے اسے معقول منافع ہونے لگا تو وہ اس جگہ کا ادھا کرایہ بھی ہمیں دینے لگا۔ انتظامی طور پر ہم نے قیصر عباس، تنویر، بخشا داور بلاول کو الگ الگ ایریا کا سپروائزر بنا دیا ان کو ورکرز بھی دے دیئے۔ جس سے ای گارڈ پروگرام کامیابی سے چلنے لگا۔ لوگ 100 روپے فی گھر ماہانہ دے کر اپنا کوڑا اُٹھوانے لگے۔

بخشاد کو ایک دن کسی نے سو روپے دینے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اُس گھر والے کو موبلائز کرنے کے لئے کہا آپ ایسا کرو کہ میرے گھر کے لئے دوکان سے روزانہ سبزی لا دیا کرو میں تمہیں سو روپے مہینہ دوں گی۔ بندے نے کہا صرف 100 روپے مہینہ؟ بخشاد نے کہا! میں پورے مہینے تمہارے گھر کا کچرا اُٹھواتی ہوں۔ جس کے بدلے تم سو روپے دینے سے انکار کر رہے ہو جبکہ تم خود صاف ستھری سبزی لانے کے سو روپے قبول نہیں کر رہے؟ اُس شخص نے اس دلیل پر فوراً سو روپے نکال کر دے دیئے۔

اسطرح ایک گھر میں جب ماہانہ کچرے کی فیس لینے گئے تو اس شخص نے 89 روپے دیئے جب پوچھا کہ پیسے کم کیوں ہیں تو وہ بولا کہ آپکا ورکر اس ماہ 3 دن نہیں آیا اس لئے میں نے 11 روپے کاٹ لئے ہیں۔

ورکر نہ آنے کی شکائت کیلئے ہم نے ٹیلی فون نمبر کمیونٹی میں دے رکھا

تھا۔ایک دن ایک خاتون نے فون کیا (جو سعدیہ ''انچارج ایڈمن'' نے اٹینڈ کیا) اور کہا کہ ''تسی چوہڑے بولنے او! آج ساڈا کچرا نہیں چکیا؟'' (آپ کوڑے والے بول رہے ہو آج ہمارا کچرا نہیں اُٹھایا؟)

قیصر عباس کو کوڑے شاہ کا لقب ملا۔ بلاول خان کو پینے کیلئے پانی نہیں ملتا تھا تو اُس نے داڑھی رکھ لی۔ تاکہ لوگ مسلمان سمجھ کر پینے کیلئے پانی دے دیں۔ ہمارے ورکر جب ہوٹلوں پر چائے پینے جاتے تو ہوٹل والے اپنے کپ میں چائے ڈال کر نہیں دیتے تھے ان کو شاپر میں چائے پینی پڑتی۔ اس پر مجھے تقسیم ہندوستان سے پہلے کے ریلوے سٹیشن کے مناظر یاد آنے لگے جس میں سنا ہے۔ کہ پانی پلانے والے صدا لگاتے کہ ''ہندو پانی لے لو''، ''مسلمان پانی لے لو'' مختلف مذہب ہونے کی وجہ سے لوگوں کو اوک میں پانی پینا پڑتا۔

پلا دے اوک میں ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے!

ان سماجی مسائل سے یہ ورکر تو روز گزرتے ہوں گے۔ ہمیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس کام کو وائٹ کالر جاب بنانے کے لئے کافی محنت درکار ہوگی۔

سمیرا نے اس پروگرام میں بچوں کی شمولیت کیلئے 20 سکولوں کے درمیان تصویری مقابلے کروائے۔ ہر سکول میں فرسٹ، سیکنڈ آنے والے بچوں کو انعامات دیئے گئے۔ پھر فاطمہ جناح یونیورسٹی کے آرٹس اور اینوائرنمنٹ سائنس کے پروفیسر صاحبان کو وزٹ کروایا اس کا فائنل مقابلہ NCA میں ہوا۔ جس

میں اختر شاہ صاحب کے بڑے بھائی نے پینٹنگ کے انتخاب میں ہماری مدد کی اس پروگرام کو فیاض باقر صاحب دیکھنے آئے ۔اگر چہ اُس روز سمیرا کے والد کا سوئم تھا مگر ہم نے اس پروگرام کو کینسل نہیں کیا بعد میں واٹر ایڈ نے نیشنل لیول پر مقابلہ کروایا اور ہمارے علاقے کے سکول کی بچی نے پہلا انعام حاصل کیا۔ NGO کے اندر نئے نئے پروگرام ڈونرز کے ذریعے آتے رہے ہیں۔واٹر ایڈ بھی رائٹ بیس اپروچ پر عملدرآمد کرنے لگی۔اور ہم پر تنقید شروع ہوئی کہ یہ جو کام آپ لوگ کر رہے ہیں۔یہ سرکار کا ہے۔ہم نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور پیپلز کالونی کی 63 گلیوں میں کمیٹیاں بنوادیں اور ان کو یہ کام سونپا کہ وہ یہ کام سرکار سے کروائیں۔ہر گلی میں تقریباً ڈیڑھ سو گھر ہیں۔اور پورے علاقے کے لئے کنٹونمنٹ کی طرف سے چھ ورکر ہیں جو مشکل سے سڑک پر جھاڑو لگا سکتے ہیں۔ہم نے کافی کوشش کی کہ رائٹ بیسڈ اپروچ پر عملدرآمد کیا جائے لیکن یہ پروگرام چل نہیں پایا۔جبکہ پہلے والا پروگرام آج 10 سال بعد ہمارے نکل جانے کے باوجود بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔

تعمیرِ نو

2000ء میں میری ساری انجمن بکھر گئی۔ میرے ساتھی ''جن کو مقامی قبضہ مافیا کی پشت پناہی حاصل تھی'' باغی ہو گئے۔ مجھے، اورنگزیب خان اور سمیرا گل کو تنظیم سے نکال دیا گیا۔ میں نے سمیرا کیلئے ڈاکٹر اختر حمید خان میموریل ٹرسٹ اور اورنگزیب خان کیلئے الفلاح ڈیویلپمنٹ آرگنائزیشن رجسٹرڈ کرایا اور خود مہناز اکبر کے ساتھ نوکری کرنے چلا گیا۔

الفلاح میں کریڈٹ پروگرام شروع کیا جبکہ AHKMT میں سنیٹیشن کا کام شروع کیا۔ انجمن کے ورثے میں ایک سکول الفلاح کے نام سے چھوڑ آیا۔ یہ تینوں ادارے آج تک اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ اور عوامی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

2000ء سے 2009ء تک اختر حمید خان ٹرسٹ کا ایجنڈا سیوریج لائن رہا۔ سمیرا نے بہت زیادہ کام کیا۔ فوجی کالونی، ڈھوک حسو، ڈھوک کالا خان، اور ڈھوک سیداں میں سیوریج لینیں بچھائی گئیں۔ راولپنڈی واسا بھی انکے کام سے واقف تھی۔ مقامی سیاسی قیادت کی سپورٹ بھی حاصل رہی اور اپنی مدد آپ کے تحت بے شمار گلیوں میں سیوریج لائن ڈالی گئیں۔ اسی دوران جنرل پرویز مشرف کی حکومت آ موجود ہوئی۔ جس نے مقامی حکومتوں کا نیا تصور دیا اور مقامی حکومتوں کو فنڈز بھی فراہم کیے۔ جسکی وجہ سے گلیوں میں کافی زیادہ کام

ہوا۔ جہاں گلی پکی ہونے کی خبر آتی سمیرا پہنچ جاتی اور لوگوں کو موبلائز کر کے سیوریج لائن ڈال دیتی اسطرح بہت سی یوسیز میں سیوریج لائن بچھ گئی۔اور نالیاں بند ہوگئیں۔کہیں کہیں پر واسا نے مین لائن بھی ڈلوائی اور گلیوں کو انکے ساتھ منسلک کیا۔اسطرح تیز ترین ترقی اور تعمیر نو ہوگئی۔بس ایک مسئلہ درپیش تھا۔ جہاں یہ لوگ سیوریج لائن ڈال دیتے وہاں گلیوں میں کوڑا ابھر کر سامنے آنے لگا۔کیونکہ پہلے تو کوڑا نالیوں میں ڈوب کر نظر نہیں آتا تھا۔اب نالیاں چونکہ بند ہوگئی تھیں۔اس لئے کوڑا باہر گلی میں آنے لگا جس سے ایک نئے مسئلے نے جنم لیا۔ جسکے لئے وقتی طور پر کچھ انتظامات کئے لیکن مستقل انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کوڑا گلیوں میں بکھرا ہونظر آتا یا خالی پلاٹوں میں ڈمپ ہو جاتا۔شہر کی صورتحال پھر بہتر تھی لیکن کنٹونمنٹ اور پوٹھوہار ٹاؤن میں حالات بہت ہی خراب ہونے لگے۔

ہمارے ایک دوست قیصر عباس نے ڈھوک سیداں میں گھر لیا۔ہم نے اسکی مدد سے چوہدری ظفر اور راجہ الطاف کو ساتھ شامل کر کے ان گلیوں میں سیوریج لائن بچھا دیں لیکن یہاں بھی کچرا ایک مسئلہ بن گیا۔

اتفاق کی بات کہ اورنگزیب خان اور قیصر عباس کو نوکری سے نکال دیا گیا اور وہ بے روزگار ہوگئے۔ہم نے ان کو ہمراہ لے کر وہاں پر ''ای گارڈ'' پروگرام شروع کیا۔اور پورے علاقے میں صفائی (کوڑا اٹھانے) کا کام شروع کر دیا اسطرح ''ای گارڈ'' کا جنم بھی ہوگیا، سالڈ ویسٹ مینجمنٹ پروگرام بھی پٹڑی پر چڑھ گیا اور ہماری روزی روٹی کا نظام بھی چلنے لگا۔

زندگی کی فیاضی

فیاض باقر لائف پراجیکٹ کے کوآرڈینیٹر(Coordinator) تھے۔ان کا نام ہم نے بہت سنا ہوا تھا۔ہمارے ایک دوست ابرارشاہ اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے کہ وہ صرف عمر اصغر کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

ایک دن ابرارشاہ نے ہمیں ماسٹر بشیر سے ملوایا۔جو مزدور کسان پارٹی میں کام کرتے رہے تھے اور وادی کاغان سے سکول ٹیچر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔انہوں نے فیاض باقر کا تذکرہ کیا۔میں نے ملنے کی خواہش ظاہر کردی۔انہوں نے کہا میں لے جاؤں گا آپ کو ملادوں گا۔

ماسٹر بشیر کے ہمراہ میں فیاض باقر کے دفتر میں چلا گیا۔ان کا دفتر ڈپلومیٹک انکلیو میں تھا۔انہوں نے ہمیں چائے پلائی اور میرے علاقے میں آنے کا وعدہ کیا۔دن اور ٹائم طے ہوگیا۔اگلے ہفتے وہ مقررہ وقت پر کیرج فیکٹری کے پاس پہنچ گئے۔جہاں ہم ان کا انتظار کر رہے تھے۔ان کے پاس UN کی بڑی گاڑی تھی۔میں ان کے ہمراہ بیٹھ گیا اور مظہر آباد اپنے سکول میں لے آیا جہاں ہمارے باقی ساتھی ان کا انتظار کر رہے تھے فیاض صاحب بہت خوش مزاج اور یاروں کے یار ہیں ایک دفعہ جس سے تعارف ہوجائے عمر بھر اُس کو نہیں بھولتے بلکہ کسی نہ کسی بہانے اس کو اپنے ساتھ منسلک رکھتے ہیں۔ہمارا

بھی یہی حال ہے آج 20 سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ ہم ان کے مریدین میں ہی شمار ہوتے ہیں۔ بہرحال مظہر آباد کے کمیونٹی سکول میں بیٹھ کر ہم نے ان کو اپنی ساری کہانی سنائی اپنے علاقے کے بارے میں بتایا۔ اور سابقہ سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ جیسے بہترین دوکاندار وہ ہوتا ہے جو اپنا حساب کتاب رکھ سکے۔ اس طرح بہترین تنظیم وہ ہوتی ہے جو اپنا حساب کتاب رکھے۔ یہ ان کا پہلا سبق تھا۔ جس پر ہم آج تک عمل کر رہے ہیں پھر انہوں نے کہا کہ آپ لوگ OPP جائیں۔ ڈاکٹر اختر حمید خان سے ملیں۔ ہم نے کہا جناب ہمارے پاس تو آنے جانے کا کرایہ بھی نہیں ہے، انہوں نے بتایا کہ اس کی پرواہ نہ کریں۔ ہم نے ایک معاہدہ OPP کے ساتھ کیا ہے جو لوگ ان کا پروگرام دیکھنے جائیں گے۔ ہم ان کے اخراجات برداشت کریں گے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ چلو کراچی کی سیر بھی کریں گے اور کام بھی۔ ہمیں چھ لوگوں کو لے جانے کی اجازت تھی۔ ہم 7 لوگ ہو گئے۔ ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچ گئے۔ میرے ساتھ اکثر لوگوں کا کراچی کا پہلا سفر تھا۔

ہم OPP پہنچ گئے۔ وہاں پر ہمارا استقبال ایوب نے کیا ہمیں کمروں میں لے گئے۔ جو OPP کے اندر تھے فریش ہونے کے بعد ہماری پہلی ملاقات انور راشد سے ہوئی۔ 3 دن کا ایجنڈہ ترتیب دیا۔

سب سے پہلے حفیظ آرائیں نے ہمیں بریفنگ دی اس نے بتایا کہ اورنگی میں سینیٹیشن کی کیا حالت تھی ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت کیسے لوگوں کو

راضی کیا کہ وہ اپنی گلیوں میں سیوریج لائین ڈالیں اور باقی پروگرام کیسے شروع کئے؟ وغیرہ وغیرہ

اگلے دن جاوید بھائی نے ہمیں سینیٹیشن کی عملی بریفینگ دی کہ ہم مین ہول کیسے بناتے ہیں۔ پائپ کتنے انچ کا ڈالتے ہیں سلوپ کیسے رکھتے ہیں۔ کتنے فاصلے پر مین ہول ہوتا ہے۔اسٹیمیٹ(Estimate) کیسے بناتے ہیں۔ غرض تمام بنیادی معلومات ہمیں دی گئیں۔ پھر ایک سیوریج لائن والی گلی وزٹ کروائی گئی۔جس میں 15 سال پہلے لائین ڈالی گئی تھی۔

تیسرے دن ہمیں ڈاکٹر شمیم نے خاصدہ اور انور راشد نے کریڈٹ کے بارے میں بریف کیا۔

اس دوران ڈاکٹر اختر حمید خان سے بھی ملاقات رہی۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ اگر یہ کام نہیں ہوسکتا تو اورنگی میں کیسے ہوگیا اور اگر اورنگی میں ہوسکتا ہے تو کہیں اور کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہماری ڈاکٹر صاحب کے بیٹے اکبر اور پروین رحمٰن سے بھی ملاقات ہوئی میں اور میرے ساتھی تانے بانے جوڑتے رہے۔کہ اپنی گلی میں سیوریج لائن کیسے ڈالیں گے۔ہم نے کراچی کا کامیاب دورہ مکمل کیا اور واپس لوٹ آئے۔اس کی رپورٹ بنائی اور UNDP کو ارسال کردی۔

ہم نے فوراً ایک گلی میں کام شروع کیا جو پہلے گورنمنٹ نے ڈالی تھی لیکن آخر تک لیکر نہیں گئے تھے ہم نے دوسری گلی میں اس کو منسلک کردیا۔اسطرح ہمیں پہلی کامیابی ملی۔اور اس لائن میں ہمیں جاوید بھائی نے بہت مدد کی۔جو

پروین رحمٰن کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے۔اور ہم ان کو مشکلات سے آگاہ کرتے اس کی پلاننگ ہمیں رشید کھتری نے کر کے دی تھی۔اور لیول بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔فیاض صاحب راولپنڈی میں ان دنوں کوئی سالڈ ویسٹ کا بڑا ماڈل کرنا چاہتے تھے۔جسکے لئے وہ لال حویلی شیخ رشید سے ملنے آئے شیخ صاحب نے جھاڑ واٹھانے سے انکار کر دیا۔

ہم فیاض صاحب کی گڈ بک میں آچکے تھے۔انہوں نے ہمیں اپنے محلے کے لئے سالڈ ویسٹ مینجمنٹ کا پروجیکٹ دیا۔جسکے تحت 2،3 سو گھروں میں کوڑا گھر گھر سے اکھٹا کرنا تھا۔اور پھر الگ الگ کر کے ٹھکانے لگانا تھا۔ندیم بخاری اور رئیس صاحب ہمیں اس میں معاونت کرتے تھے۔ہم نے مظہر آباد میں 10 گلیوں کا انتخاب کیا۔سمیرا کو سوشل آرگنائزر لگایا۔لائن میٹنگ کی اور لائن منیجر بنائے۔سب لوگوں کو بتایا کہ 10 روپے ماہانہ دینا ہوگا۔سب راضی ہو گئے۔

ہم نے شہر کے دوسرے کارنر سے سینیٹری ورکر ڈھونڈا۔جس کو معذوری کی وجہ سے سرکاری نوکری نہیں مل رہی تھی۔اور وہ سود کے چکر میں پھنس گیا تھا۔اس کو چھلی والی ایک ریڑھی 2 ہزار روپے میں بنوا کر دی اور گھر گھر سے کچرا اکھٹا کرنے پر لگا دیا۔لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی اور لوگوں نے رقم بھی ادا کرنا شروع کر دی۔

سینیٹری ورکرز کے اس جوڑے (حمیدہ اور جاوید) کو میں نے اپنے سکول کے اوپر رہنے کیلئے ایک کمرہ بنا دیا۔اور سود سے جان چھڑانے کیلئے اپنے ادارے سے پانچ ہزار روپے قرض دے دیا۔اسطرح اس جوڑے نے بڑی محنت

سے کام کیا۔ہم نے پہلے دن سے ان کو کوئی تنخواہ نہیں دی۔ یہ اپنی مدد آپ کے تحت چلتے رہے۔ایک مشکل جو درپیش آئی وہ ڈمپنگ پوائنٹ کی تھی ۔ہم نے میونسپل کارپوریشن سے کوشش کر کے اپنے محلے میں چھ ماہ میں کنٹینرز رکھوایا پھر چھ ماہ میں اُٹھوایا۔ پھر ہم کچرا ریلوے روڈ کے کنارے لیکر جاتے تھے جہاں سے میونسپلٹی والے اٹھا کر لے جاتے تھے۔اس تمام عرصے میں ہم فیاض صاحب کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہے۔ہم سویپ پراجیکٹ کے ڈیزائین میں شامل رہے۔اوراپنے خدشات وتجربات سے ان کو آگاہ کرتے رہے۔ان کے دیے گئے ٹولز آج بھی استعمال ہورہے ہیں۔

ہم بھی آج تک ان کے سیکھائے ہوئے سبق پر چل رہے ہیں۔ جاوید مسیح فوت ہوگیا۔لیکن حمیدہ اپنے بچوں کے ہمراہ اسی ریڑھی سے آج بھی 7سوگھروں کا کچرا اکھٹا کررہی ہے۔فیاض صاحب نے ہمیں اس کے بعد بھینسوں کے گوبر کوٹھکانے لگانے کیلئے پروجیکٹ دیا اورشہر میں رکشوں کے اندر LPG کٹ لگانے کیلئے بھی مالی معاونت کی۔

غرض ہر مشکل گھڑی میں فیاض صاحب ہمارے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔اوران کے چلائے ہوئے پروجیکٹ پرآج ہم عمل کرکے پورے پاکستان میں لوگوں کو تربیت دے رہے ہیں۔اسی ریڑھی کے ساتھ سندھ، کراچی، چترال،راجن پور،لاہور میں کام شروع کیا۔یہ ریڑھی ہمارے لئے لائف لائن بن گئی ہےاورزندگی ہم پرفیاض ہوگئی ہے۔

کچرے میں جنم

70 کی دہائی میں ہم گاؤں سے شہر منتقل ہوئے تو ہمارا کاروبار شہر کے وسط میں تھا لیکن گھر مضافاتی علاقے میں تھا۔ جو میونسپل کمیٹی کا ڈمپنگ پوائنٹ تھا۔ یہ ڈمپنگ پوائنٹ نالہ لئی کے قریب تھا۔اس پوائنٹ پر ایک خاندان آ کر آباد ہوا جو اس ڈمپ سے پرانے کپڑے اور جوتے نکالتے ۔اور جوتے مرمت کر کے اتوار بازار میں فروخت کرتے تھے۔اور پرانے کپڑے نالہ لئی میں دھوتے اور سکھا کر بنڈل بناتے۔ جو شہر میں مستری گاڑیوں کی مرمت کے دوران ٹاکی کے طور پر استعمال کرنے کے لئے لے جاتے۔ یہ گروہ شروع میں تو چند گھرانے تھے ۔لیکن بعد میں بڑھتے بڑھتے چار سو گھروں تک پہنچ گئے۔اس طرح ایک اور خاندان یہاں آ کر آباد ہوا جنہوں نے بھینسیں رکھی ہوئی تھیں۔ شاید ان کی بھینسوں کا چارہ بھی اس ڈمپنگ پوائنٹ سے حاصل ہوتا ہو۔لیکن ان بھینسوں کا گوبر گند میں مزید اضافہ کر دیتا تھا۔مقامی راجوں نے اس گوبر اور کچرے سے فائدہ اٹھایا۔وہ مختلف فصلیں اور سبزیاں کاشت کر کے۔اس ویسٹ کو استعمال کرتے ۔اسطرح زیادہ تر کچرا ری سائیکل ہو جاتا۔ میرا بچپن ان تمام لوگوں کے درمیان ان چیزوں کا ملاحظہ کرتے گزرا۔ میں دن بھر یہ چیزیں نوٹ کرتا رہتا۔نالہ لئی کے کنارے گلاب کے پھولوں کا ایک باغ بھی تھا۔ جو نالے کے پانی سے سیراب ہوتا تھا۔گوبر اور کچرے کی کھاد سے بڑھتا۔اور شہر

میں ہار اور گجرے کی صورت فروخت ہو کر لوگوں کو خوشبو مہیا کرتا تھا اسی طرح یہاں ایک اور کاروبار بھی چل رہا تھا۔

ہماری اس آبادی کے ایک کارنر میں ایک سیکس سنٹر بھی تھا۔شہر کے لوگ یہ گند بھی یہاں ڈسپوز آف کرتے تھے۔جس سے ایک اور بڑا خاندان پل رہا تھا۔اگر چہ یہ لوگ اوپر والے باقی خاندانوں کی طرح ایک علاقے کے نہیں تھے لیکن پیشے کے اعتبار سے ایک فیملی کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

غرض شہر کی غلیظ ترین آبادی میں ہم نے جنم لیا اور پلے بڑھے۔ایک فائدہ اس آبادی کا یہ تھا کہ یہ علاقہ شہر کے قریب ترین تھا۔یعنی راولپنڈی کے مرکزی بازار ''راجہ بازار'' میں آپ یہاں سے پیدل دس پندرہ منٹ میں پہنچ سکتے تھے۔اس آبادی کے چند نوجوانوں میں سے ایک میں بھی تھا جس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہاں آبادی بڑھ گئی۔اور میونسپلٹی کا ڈمپنگ پوائنٹ بھی ختم ہو گیا۔لیکن مقامی لوگوں کا کاروبار وہی رہا۔اب اس آبادی کے بچے پورے شہر میں کچرا چنتے اور نوجوان لڑکیاں ڈھیروں پر ٹاکیاں چن کر لاتیں اور فروخت کر کے گزر بسر کرتی تھیں ان لوگوں کے گھر بھی شروع شروع میں اسی کپڑے سے بنے ہوتے تھے۔وقت کے ساتھ ساتھ ان گھروں کو دیواریں لگ گئیں۔اور باقاعدہ گلیاں بن گئیں۔

ایک دوست کے ذریعے موجودہ انفارمیشن منسٹر مریم اورنگزیب کی ماں

طاہرہ اورنگزیب (MNA) سے تعارف ہوگیا۔ وہ اس وقت میونسپل کارپوریشن کی لیڈی کونسلر تھی۔ بلکہ اس کی بڑی بہن نجمہ حمید (موجودہ سنیٹر) بھی کونسلر تھی۔ ہم نے اپنے علاقے کی صورتحال ان کو بتائی۔ انہوں نے ایک تنظیم بنائی ہوئی تھی۔ ''انجمن تہذیب نسواں'' اس کے تحت مجھے جنرل سیکرٹری بنایا اور کچھ مشینیں سلائی کڑھائی کیلئے اس علاقے کی بچیوں کیلئے دیں۔ میں نے ٹاکیاں چننے والی لڑکیوں کو ہنر کی طرف راغب کیا۔ اور تقریباً 10 سال میں ایک ہزار لڑکیوں کو سلائی کا کام اپنی مدد آپ کے تحت سیکھایا۔ بعد میں میں نے اپنی تنظیم رجسٹر کروائی جس کا نام ''انجمن فلاح و بہبود'' تھا جس کے تحت میں نے کاغذ چننے والے بچوں کیلئے کمیونٹی سکول بنایا۔ اور ایک ہزار سے زیادہ بچوں کو اس سکول میں پڑھایا۔ میں خود بھی ساتھ ساتھ پڑھتا رہا اور اصغر مال کالج راولپنڈی سے گریجویشن کی۔ جس کے 20 سال بعد ایم۔اے سیاسیات کا امتحان میں نے اور سمیرا نے اکھٹے پاس کیا۔

سمیرا بھی ہماری برابر والی گلی میں رہتی تھی۔ اور جب میں نان فارمل سکول چلا رہا تھا۔ تو وہ بھی میرے ساتھ اپنے گھر میں ایک سکول چلا رہی تھی۔ جس میں اپنی گلی کے 40۔50 بچوں کو بیک وقت پڑھاتی سمیرا کی ماں بچوں کو قرآن مجید پڑھاتی۔

اسطرح ہم نے ان خاندانوں کو مہذب زندگی کی دوڑ میں شامل کیا۔ ان کو نہ صرف تعلیم یافتہ بنایا بلکہ باہنر بھی کیا۔ یہ تقریباً 13 سو خاندان بنتے ہیں جن

کی ہم نے تعلیم و تربیت کی ۔اس دوران علاقے کے بہت سارے نوجوان ہمارے ساتھ آملے اور نہ صرف اپنے خاندانوں کو سنوارا بلکہ دوسرے خاندانوں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے یہاں پر سالڈ ویسٹ کا پائلٹ کیا۔سیوریج لائن ڈالی۔چھوٹے قرضوں کا اجراء کیا۔

ہمارا یہ کام فیاض باقر اور عارف حسن تو تسلسل سے دیکھتے آرہے تھے۔ ڈاکٹر اختر حمید خان بھی دیکھنے آگئے۔ہم جب سعودی ٹاور میں UNDP کے آفس 9th فلور میں جاتے تھے۔تو میں اپنے دوستوں سے مذاق کرتے ہوئے کہتا کہ یہ کچرے کی طاقت ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ورنہ ہمیں کون پوچھتا۔

اسطرح امریکی سفیر (Wendy Chamberlin) وینڈی چیمبر لین اور یورپین سفیر کِٹ جَول بھی ہم سے اس علاقے میں ملنے آئے۔

ایک دفعہ لندن سے 15 ملکوں کے 15 سٹوڈنٹ ہمارے پاس 15 دن تسلسل سے آتے رہے۔مجھے اور سمیرا کو اس علاقے میں کام کرنے کی وجہ سے امریکی حکومت کی طرف سے امریکہ میں وزٹ کرنے کا موقع بھی ملا سمیرا اس کے بعد اب تک 14 ممالک کا سفر کر چکی ہے۔

لہٰذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سیاسی ،سماجی اور معاشی جنم کچرے میں ہوا، کیونکہ سمیرا کو سماجی خدمات کے عوض راولپنڈی شہر کی پیپلز پارٹی کی جنرل

سیکرٹری بنادیا گیااوروہ ٹاؤن ممبر بھی منتخب ہوئی۔انسانی حقوق کا صدراتی ایوارڈ صدر پاکستان کی طرف سے ان کو مل چکا ہے۔

مجھے امریکی ادارے میں نوکری مل گئی۔اور 8 سال تک پاکستان کے مختلف علاقوں میں سرکاری سکولوں کی بہتری کیلئے کام کرتا رہا۔

اب UN کی مدد سے IRRC بنالیا۔اور زندگی کا مشن یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں کچرا ٹھکانے لگانے کیلئے عوام اور اداروں کی تربیت کرتے ہوئے باقی زندگی بھی صرف کردوں۔

اتفاق کی بات ہے۔کہ پاکستان کے اس پہلے IRRC کا افتتاح بھی طاہرہ اورنگزیب کی بیٹی مریم اورنگزیب نے کیا،جس نے 30 سال قبل ہمیں پہلی دفعہ سلائی مشینیں دی تھیں۔جو آج مجھے یہ سطور رقم کرتے ہوئے یاد آیا۔

ہماری دیگر مطبوعات

ہمارے تجربات	حمید اللہ
محاصل کچرا	حمید اللہ
محاصل کچرا (سندھی ترجمہ ڈاکٹر اے کے پنجوانی)	حمید اللہ
کچرے میں جنم	حمید اللہ
ہم غریب شہری	سمیرا اُگل
ہمارے رہنما	سمیرا اُگل
مانک موتی لعل (اُردو ترجمہ ڈاکٹر اے کے پنجوانی)	فقیر عبدالرسول قادری
دہ ملنگِ کشکول (پشتو شاعری)	تاجبر خان ملنگ
پاکستان کی سیاسی حالت	ذوالفقار علی بھٹو

ڈاکٹر اختر حمید خان میموریل ٹرسٹ

CB-110، ویلی ویسٹریج III، راولپنڈی کینٹ فون نمبر 051-5466444, 0336-5466444

www. ahkmt.org, e-mail: ahkmt2000@gmail.com